ناول

اگن برکھا

عفت موہانی

AGAN BIRHA KI
By Iffat Mohani
Rs 42/- ED 1990

قیمت
بیالیس ۴۲ روپے

ناشر نسیم بک ڈپو۔ ۲۵ گوتم بدھ مارگ لکھنؤ ۱۸
فون آفس: ۲۴۴۵۵۹ ; رہائش: ۲۲۵۳۳۴
NASIM BOOK DEPOT, 25-G.B. MARG, LUCKNOW

باہتمام فہیم انہونوی (بار اول ۱۹۹۰ء) مطبع نامی/نظامی پریس لکھنؤ

شادی کا گھر تھا گہما گہمی تھی۔ ہلچل اور زندگی تھی۔ خوشبوں، روشنیوں اور مسرتوں کا شہر تھا۔ احمد صاحب کا گھر کیا تھا۔

بڑے دالان میں شفاف چاندنی کا فرش تھا۔ جگہ جگہ پھولدار مخملی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ان سے ٹیک لگائے معزز خواتین گفتگو میں مصروف تھیں بارات مغرب کے وقت تک آنے والی تھی۔ مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ جب بھی نئی خواتین دالان میں آتیں۔ ایک نئی اور مسحور کن خوشبو آس پاس بکھر جاتی۔

شادی احمد صاحب کی بڑی لڑکی الماس کی تھی۔ اس کے کمرے میں بھی اس کی سہیلیوں اور رشتے دار عورتوں کا ہجوم تھا۔ بار بار لڑکیاں کسی کام سے باہر نکل رہی تھیں۔ زرق برق لباس، عجیب و غریب میک اپ اور نت نئے بالوں کے اسٹائل سے سجی۔ وہ سب کافوری مجسمے معلوم ہو رہی تھیں خوشیوں سے دمکتے چہروں پر ایسا نکھار تھا کہ نظریں خیرہ ہو رہی تھیں۔

دالان کے ایک گوشے میں نسبتاً سب سے الگ تھلگ یاور صاحب کی بیوی بیٹھی بڑی سنجیدہ نگاہوں سے لڑکیوں کی آر جار کو دیکھ رہی تھیں ان کے پاس ان کی لڑکی خاموش بیٹھی خود بھی چہل پہل دیکھ رہی تھی۔

دفعتہً اس نے چپکے سے ماں کے بازو پر ہاتھ رکھ کر ان کی توجہ ایک لڑکی کی طرف مبذول کرائی۔ یاور صاحب کی بیگم نے ادھر دیکھا تھا اور پھر پلکیں جھپکانا بھول گئیں۔ ستون سے ٹیک لگائے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ہلکے کاسنی رنگ کے خوشنما لباس میں ملبوس۔ ہلکا پھلکا زیور پہنے۔ اسکے

سیاہ دراز بالوں میں گلاب کے پھولوں کا ننھا سا گچھا سجا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اتنی حسین اس قدر دلکش تھی کہ بیگم یاور اس پر سے نگاہیں نہ ہٹا سکیں۔

"امی! آپ نے دیکھا!" سرگوشی میں سدرہ بولی۔ "کتنی پیاری لڑکی ہے۔ اپنے بھائی جان کے لئے ایسی ہی لڑکی چاہئے امی۔ اسے بلا لیجئے نا۔ پوچھئے کیا نام ہے اس کا۔ کہاں رہتی ہے۔ اور ذرا اسے پاس سے بھی دیکھیں۔"

"کیا سمجھے گی۔" بیگم یاور نے جواب دیا۔ "اسے پاس بلا کر صرف نام پوچھنا تو کوئی معقول بات نہیں ہے۔"

"امی! وہ کہیں چلی نہ جائے" سدرہ بے تاب تھی۔ اسے وہ اجنبی لڑکی جو ضرورت سے زیادہ خوبصورت تھی بے حد پسند آئی تھی۔ وہ اسے گھورے جا رہی تھی۔ بیگم یاور بھی اسکو دیکھ رہی تھیں۔ اور لمحہ بہ لمحہ ستائشی احساس ان کے دل میں جاگتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کس کی لڑکی ہے کس گھر کے آنگن میں اُجالا پھیلانے والا چاند ہے۔ اور کس کے گھر جا کے روشنی پھیلائے انھوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ خدا کرے یہی لڑکی ان کے بیٹے کی دلہن بنے۔ وہ بھی تو لاکھوں میں ایک تھے۔ خاندان بھر میں مثالی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اعلیٰ ملازمت۔ خوبصورت ایسے کہ پہلی نظر ان پر پڑتی تھی اور وہیں منجمد ہو جاتی تھی۔ اونچے پورے شاندار سنجیدگی اور تہذیب کا پیکر۔ یہ لڑکی شاید ان ہی کے لئے تخلیق ہوئی تھی۔ عجیب معصوم حسن تھا۔ دل موہ لینے والا۔ گلابی گلابی چہرہ، یاقوتی لب۔ مسکراتی تو موتیوں کی قطار دمکنے لگتی۔ سیاہ دراز بالوں کی چوٹی کچھ گندھی کچھ کھلی پیٹھ پر پڑی تھی۔ چند لٹیں شفاف پیشانی پر جھوم رہی تھیں۔ جنھیں وہ بار بار اپنی مومی انگلیوں

پر لپیٹ کر بالوں میں کھونس رہی تھی۔ مگر وہ سر کی جنبش سے پھر اس کی پیشانی پر آ گرتیں۔ سر سے پاؤں تک حسنِ معصوم کا پیکر۔

پھر دفعتہً وہ دالان کی طرف آئی۔ اور تب ہی بااختیار اسے بیگم یاور نے آواز دے دی۔

"بیٹی! سنو!"

کئی نظریں ستائشی جذبوں سے معمور اس کی طرف اٹھ گئیں۔ مگر وہ بیگم یاور کے پاس آ کر بے حد دلکش انداز میں جھک گئی۔ اور میٹھی سی آواز میں بولی۔ "جی۔ فرمائیے۔"

"بیٹی! مجھے ایک گلاس پانی چاہئیے۔" بیگم یاور نے کہا۔

"جی۔ خالہ امی۔ فریج کا پانی لاؤں یا صراحی کا۔" اس نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ اور مسکرا کر سدرہ کی طرف یوں دیکھا کہ وہ بالکل ہی وارفتہ خطی ہو گئی۔ پاس سے تو وہ اور بھی قیامت ساماں لگ رہی تھی۔

"فریج کا نہیں۔ دانتوں میں لگتا ہے۔ تم صراحی کا پانی لے آؤ۔"

"بہت اچھا۔ ابھی لائی۔" وہ تیز تیز قدم رکھتی ایک طرف چلی گئی۔

"سچ مچ بہت پیاری ہے۔" بیگم یاور نے کہا۔ سدرہ تو مسحور سی بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بس وہ اجنبی لڑکی اس کے سامنے بیٹھی رہے۔ اور وہ اسے تکا کرے ایسا سحر انگیز حسن اس نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

"میں تو یہاں ہمیشہ آتی رہتی ہوں۔" بیگم یاور نے کہا۔ "احمد بھائی کی بیوی صفیہ باجی سے میری اچھی جان پہچان ہے۔ اکثر تقریبوں میں ملنا جلنا ہوتا ہے۔ جب بھی آئی بس الماس بی کو دیکھا۔ یہ لڑکی تو آج تک نظر ہی نہیں آئی۔ کیا پتہ احمد بھائی ہی کی بچی ہے کہ مہمانوں میں کسی کی ہے۔"

"اگر مہمانوں میں کسی کی ہوئی تب ؟" سدرہ نے بے تابی سے پوچھا۔
"بیٹی ہتھیلی پر سرسوں تھوڑی جمتی ہے۔" بیگم یاور بولیں۔ "تم تو یہ چاہتی ہو کہ بس جو بات دل میں آئے پوری ہو جائے۔ ایسا کہاں ممکن ہے؟"
"امّی! آپ بھی تو بھائی جان کے لئے لڑکیاں دیکھنے جاتی ہیں۔" سدرہ نے برا مانا۔

"کسی کو زبردستی سمیٹ لانے کا ارادہ تھوڑی ہوتا ہے۔" وہ اس کے بچپنے پر ہنس دیں۔ "تم اس لڑکی سے کوئی امید نہ باندھنا۔ کیا خبر۔ ابھی تک اس کی شادی ہوئی ہے کہ نہیں۔ شادی شدہ نکلی تو تمھیں بڑا صدمہ ہوگا۔"
"آ رہی ہے۔ وہ امّی! نام وام اور ضروری باتیں پوچھ لیجئے گا۔" سدرہ نے چپکے سے کہا۔ لڑکی پانی لے آئی۔ بڑا اہتمام کیا تھا۔ شفاف چمکدار ننھی سی ٹرے میں جھم جھم کرتا گلاس تھا۔ اور گلاس پر بڑا خوبصورت موتیوں کی جھالر دار سرپوش۔ اس نے ادب سے جھک کر پانی بیگم یاور کو پیش کیا اور مسکراتی ہوئی بولی۔

"خالہ امّی آپ کو کچھ اور نہیں چاہئے۔ شربت، آئسکریم یا پھر کافی، چائے؟ آپ جو کہئے میں لے آؤں۔ اور۔ آپ کے لئے بھی۔ وہ بے حد دلفریب انداز میں ہنس کر سدرہ سے بولی۔

جواب میں سدرہ بھی پیار سے مسکرائی۔ "یہ چیزیں مجھے نہیں چاہئیں بلکہ مجھے تو ——— !"

"کہئیے" وہ ہنس رہی تھی۔ اس کے خوبصورت گالوں میں خوشنما گڈھے پڑ گئے۔ بس اسی کی کسر تھی۔ خدا نے تمھیں فرصت اور دلجمعی سے بنایا ہے۔ سدرہ نے سوچا۔ اور پھر بے تکلفی سے بولی۔

"مجھے تو آپ چاہئیں۔"

"اچھا" اب کی وہ یوں ہنس دی جیسے کانسی کی تھالی میں چاندی کے گھنگھرو ٹوٹ کر بکھر گئے ہوں۔ بیگم یاور نے پانی پی کر گلاس ٹرے میں رکھ دیا۔ اور سدرہ کی بے تابی محسوس کر کے وہ اس سے پوچھ بیٹھیں۔

"بیٹی! کیا نام ہے تمہارا۔"؟

"یسارا!"

"تم احمد صاحب کی بیٹی ہو؟"

"جی!"

"تم وہی ہو۔ جو علیگڈھ میں رہتی تھیں؟"

"جی ہاں!"

"اچھا۔ تب ہی میں تمہیں پہچان نہ سکی تھی۔" بیگم یاور نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی۔ دراصل میں تو چچا جان کے پاس رہ کر علی گڈھ میں پڑھتی تھی۔ اب بی۔ اے کا امتحان دے کر باجی کی شادی میں آئی ہوں۔"

ان کی تفتیش کے معنی و مفہوم سے بے خبر وہ معصومیت سے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ "اب میں یہیں رہوں گی۔ میں نے ابّا سے کہا تھا اگر میں پاس ہو گئی تو مجھے آگے پڑھنے کی اجازت دیں۔ وہ کہنے لگے نہیں۔ ہم تمہیں مردانہ کالج میں نہیں پڑھوائیں گے۔ باجی بھی بی۔ اے ہیں۔ میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ ایم۔ اے کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لوں۔ مگر میں ابّا کی نافرمانی نہیں کر سکتی۔"

"ہاں بیٹی! ابّا کا کہنا مانو تم بہت پیاری بچی ہو۔ مردانہ کالج میں تو

تمہیں قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے۔" بیگم یاور نے کہا۔ اس کی بھولی بھولی باتیں انھیں بے حد اچھی لگ رہی تھیں۔

"آپ ہمارے ہاں آیئے نا۔" سدرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ مجھے اتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ آپ کو اپنے آنچل میں چھپا کر بھاگ جاؤں۔"

"ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ "ابا۔ امی مجھے ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔ ابا مجھے بے حد چاہتے ہیں۔ لمحہ بھر کو اپنے سے الگ نہیں جانے دیتے۔"

"پھر آپ کو علیگڈھ میں کیسے چھوڑ رکھا تھا۔" سدرہ بولی۔

"وہ تو مجھے چچا جان زبردستی لے کر چلے گئے تھے۔ ان کے بچے نہیں ہیں۔ انھوں نے ابا سے کہا تھا کہ دلدار کو مجھے دے دیجئے۔ ابا نے جواب دیا کہ پھر اس کے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گا۔ ابا ہر تیسرے روز مجھے خط لکھتے تھے اور فون تو روز کرتے تھے۔"

دفعتہً دور سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔ "بارات آرہی ہے۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑی ہوگئی اور سدرہ سے بولی۔ "چلئے بارات دیکھیں۔" سدرہ تو اس پر مرمٹی تھی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دونوں تقریباً بھاگتی ہوئی ہال سے باہر نکل گئیں۔

"کاش یہ بچی میرے گھر میں اجالا پھیلائے۔" بیگم یاور نے آہ بھر کر کہا۔ اور پھر اٹھ کر دالان کے سرے پر آگئیں۔ احمد صاحب کی بیوی دلہن کے کمرے سے نکل کر بارات دیکھنے اور سمدھنوں کی پذیرائی کرنے وہیں آگئی تھیں۔ بیگم یاور نے انھیں داماد کی مبارکباد دی۔ وہ بے حد

اداس نظر آرہی تھیں بیگم یاور نے کہا۔

"یہی تو دنیا کی ریت ہے بہن۔ پیغمبروں اور بادشاہوں نے بیٹیاں نہیں بٹھائیں۔ ہم تم کون شمار میں ہیں۔ بیٹی گھر بٹھانے کی چیز ہی نہیں بس ماں باپ اسے جنم دینے کے گنہگار ہوتے ہیں۔ وہ تو جنم کی گھڑی ہی سے پرائی ہوتی ہے۔ اللہ سے دعا اتنی کرنی چاہیئے کہ جس گھر میں جائے خوش رہے۔ اس کے سوا ماں باپ کے بس میں اور کچھ بھی نہیں۔ کیا غارت گیا لین دین یہاں بھی ہوا۔"

"اللہ کا شکر ہے" بیگم احمد نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا کچھ نہیں ہوا۔! انھیں الماس پسند آگئی تھی۔ کہنے لگے ہم دونوں طرف سے بیاہ کر لے جائیں گے۔ مگر بھلا ایسا ہو سکتا تھا۔ الماس کے ابا نے جہیز ہی دیا۔ اور جوڑے دھوڑے کے نام پر انھوں نے ایک پیسہ بھی لینا گوارا نہ کیا۔"

بارات گیٹ کے اندر آ چکی تھی۔ مہمان خواتین سب اٹھ کر بالکونیوں اور باہر مردانے کی چلمنوں کے پاس آ کر دولہا کو دیکھ رہی تھیں۔ روایتی دولہا لگ رہا تھا۔ مشجر کی چمکتی ہوئی شیروانی میں اس کا ابھرا ابھرا، خوبصورت جسم پھوٹا نکلتا تھا۔ چوڑی دار پاجامہ زرکار سلیم شاہی جوتا۔ اور سر پر زرنگار صافہ جس سے بندھا گھنا گھنا سہرا اس کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ اس کے یہاں قدم رکھتے ہی عروسی مہک فضا میں پھیل گئی۔ بیگم احمد بھی بیگم یاور کے ساتھ بالکونی میں اُکھڑی ہوئی تھیں ان کے چہرے پر لازوال مسرت کا نور تھا۔ اس نور کے پیچھے بیٹی کی جدائی اور مستقبل کے اندیشوں کا ہلکا سا غبار بھی تھا۔

"ماشاء اللہ۔ بڑا خوبصورت لڑکا ہے" بیگم یاور نے کہا۔ "اللہ

الماس کی تقدیر چاند سورج کی طرح کر دے۔ لڑکا کرتا کیا ہے آپ کا کوئی عزیز ہے؟۔

"نہیں بھابی غیر لوگ ہیں۔ مہینہ بھر پہلے جعفری صاحب کے پوتے کے عقیقے میں جانا ہوا تھا۔ وہیں لڑکے کے والدین بھی مدعو تھے۔۔ جعفری صاحب کی بیوی کے کوئی عزیز ہوتے ہیں۔ انھوں نے الماس کو دیکھ کر اسی وقت اپنے لڑکے کا پیغام دے دیا۔ اور ایسے مُصر تھے کہ اسی وقت منگنی کرنے پر بھی اصرار کر رہے تھے۔ جعفری صاحب نے لڑکے کی ضمانت لی تھی اور الماس کے ابّا سے کہا تھا کہ میں الماس کا ذمہ دار ہوں۔ آنکھیں بند کر کے پیغام قبول کر لیجئے۔ اب آپ تو جانتی ہیں کہ الماس کے ابا اور جعفری صاحب میں بچپن کے زمانے کی دوستی ہے۔ انھیں رشتہ قبول کرنا ہی پڑا۔ میں سمجھتی ہوں کہ مہینہ بھر بھی پورا نہ ہوا ہوگا کہ تقاضوں کی ڈور باندھ دی انھوں نے۔ چلئے بھابی اب لڑکی کی تقدیر۔ کہتے ہیں بھابی کہ پہلا مول سونے کا تول۔ ہم نے بھی ہاں کر دی اور سوچا کہ اچھا رشتہ خواہ مخواہ کیوں چھوٹا جائے۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ الماس کی تقدیر سسرال میں بہتر کرے۔ میکے میں جب تک لڑکی رہتی ہے اس کی کوئی تقدیر ہی نہیں ہوتی۔" یہ کہہ کر وہ خفیف سی ہنس دیں۔

"سچ ہے۔" بیگم یاور نے تائید کی۔ "میری سدرہ کے لئے بھی دعا کیجئے۔ ہاں۔ اور آپ کی دوسری بیٹی ——— اس کو آج میں نے پہلی دفعہ دیکھا ——— ماشاء اللہ اتنی پیاری ہے کہ اس پر نظر جاتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ بس دیکھا ہی کرو۔"

"ہاں وہ سب بے بیاری ہے۔ آپ یسارہ کو کہتی ہیں نا۔ وہ تو بس اپنے چچا کی بیٹی ہو گئی ہے۔" انھوں نے مبہم انداز میں کہا۔ "چلئے اندر چلیں۔ نکاح کے لئے مرد زنانے حصّے میں آنے والے ہوں گے؟"

بیگم بادر کے ہونٹوں تک آ کے رہ گیا تھا کہ یسارہ کو وہ اپنے بیٹے مصطفےٰ کے لئے مانگ لیں۔ مگر بات ان کے لبوں تک آ کے رک گئی۔ ایسے ہنگامے میں سنجیدہ بات کرنے کی بھی نہ تھی۔ ان سے ملاقات تو ہوتی ہی رہتی تھی پھر کبھی پوچھنے کا ارادہ کر کے وہ بیگم احمد کے ساتھ دالان میں آ بیٹھیں۔ نکاح کا سنجیدہ ترین وقت تھا۔ شور رک رہا تھا۔ خواتین پردے میں ہو جا بیٹھیں۔ بیگم احمد دلہن کے کمرے میں جا چکی تھیں۔ مگر بیگم بادر کے دل و دماغ پر وہ خوبصورت لڑکی اس طرح چھا گئی تھی جیسے وہ اپنے گرد و پیش ہی سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ وہ پھر دکھائی دینے لگی۔ اب اس نے دوسرا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ ہلکا گلابی رنگ کا چمکدار لباس تھا۔ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس لباس پر افشاں کہاں چھڑکی ہوئی تھی۔ مگر وہ جس رخ پر بھی ہوتی یوں معلوم ہوتا کسی نے چاندی کے برادے میں ڈبو کر اسے نکالا ہو۔ اس قدر پیاری لگ رہی تھی کہ صرف بیگم بادر ہی کی نظریں اس کی بلائیں نہیں لے رہی تھیں۔ اور بھی کئی خواتین اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ہر گھر میں بیٹے موجود تھے۔ چاہے جیسے بھی تھے۔ مگر ہر ماں کی آرزو یہی تھی کہ جنت کی یہ حور انھیں کے گھر میں آئے۔

سدرہ کچھ سوچ کر دلہن کے پاس جا بیٹھی تھی۔ وہ اس گھر اور الماس کے لئے اجنبی نہ تھی۔ یہاں اس کی دوسری سہیلیاں بھی تھیں۔ مگر اب ان سب کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ صرف یسارہ کی دید

کی جستجو میں وہ الماس کے پاس گھسی بیٹھی تھی۔ نکاح کے بعد مہمانوں کی ضیافت کا دور چلا۔ اور جب رخصتی کا غلغلہ بلند ہوا تب الماس کی سہیلیاں اسے دلہن بنانے لگیں۔ یسارا کا کام ختم ہو چکا تھا وہ کمرے میں آئی اور بہن کی جدائی سے متاثر مغموم و دلگیر سی ایک طرف جا بیٹھی۔ حسن مغموم کی عجیب دلکش سی تصویر تھی۔ کہ سدرہ الماس کے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

کیسا عجیب وقت ہوتا ہے نا۔ جب ایک لڑکی ماں باپ کے گھر سے سسرال جاتی ہے۔" بات چھیڑنے کی غرض سے سدرہ بولی۔

"جب میری بڑی بہن تارہ باجی کی شادی ہوئی تھی۔ میں بھی اس قدر روئی تھی۔ کہ دولہا بھائی نے گھبرا کر کہا تھا۔ کہ اچھا بھائی ہم تمھاری باجی کو رخصت کر کے نہیں لے جائیں گے۔ بلکہ ہم بھی یہیں رہ جائیں گے تمھارے پاس۔"

وہ چپکے سے ہنسی۔ "آپ کو بھی بہت محسوس ہو رہا ہے۔ اب آپ اکیلی رہ جائیں گی۔"

"ہاں۔" یسارا نے اپنا خوشنما سر ہلایا۔ "میں تو اتنی بدنصیب ہوں کہ اپنی باجی سے ہمیشہ ہی الگ رہی ہوں۔ جانے کب سے چچا جان لے کے چلے گئے تھے۔ ان کے اپنے بچے نہیں ہیں۔ وہ مجھے چاہتے بھی اتنا ہی ہیں۔ کہ جب میں یہاں آنے کا ارادہ کرتی تھی وہ بے حد اداس ہو جاتے تھے۔ چچی جان تو رونے ہی لگتی تھیں۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ میں ان لوگوں کو آزردہ کر کے کیسے آجاتی۔ وہی تو ماں باپ بن گئے ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ان کے پاس کب گئی تھی۔ شاید

برسوں ہو گئے۔ اب مشکل سے آسکی ہوں۔ امتحان کے بعد۔"

"آپ کے چچا جان اور چچی جان بھی آئے ہوں گے؟"

"نہیں آ سکے۔" اس نے اداسی سے سر ہلایا۔

"چچا جان کو بزنس ٹور پر بڑی جلدی اٹلی جانا پڑا۔ چچی جان کے بڑے گھر کا کیس چل رہا ہے۔ وہ بھی نہیں آئیں۔ وکیل صاحب نے ان سے کہا تھا کہ فیصلے کی تاریخیں قریب ہیں۔ اس زمانے میں آپ کا کہیں جانا ٹھیک نہیں۔ چچی جان تو تڑپ ہی کے رہ گئیں۔ اور پھر باجی کی شادی تو جیسے منگنی پٹ بیاہ کی طرح ہوئی ہے۔ چچی جان نے میرے ہاتھ ان کے اور دولہا کے لئے لباس سلام کرائی اور باجی کے لئے زیور بھیجے ہیں۔ شاید عدالت کی پیشی کے بعد آئیں گی۔"

"اب آپ نہیں رہیں گی۔ چلی جائیں گی علی گڑھ؟" سدرہ نے پوچھا۔

وہ یکبارگی ہنس دی۔ "سدرہ مجھ میں ایک کمزوری سی ہے کہ میں کبھی کسی بزرگ کا کہنا ٹال نہیں سکتی۔ جو ان کا فیصلہ وہی میرا فیصلہ۔ اگر چچی جان ساتھ لے چلنے پر اصرار کرنے لگیں تو جانا پڑے گا۔ اتنا چاہتی ہیں نا مجھے کہ بس۔ اگر امی نے نہیں بھیجا تو یہیں رہوں گی۔ میری اپنی مرضی اپنی کوئی رائے نہیں۔"

"میرا دل تو یہی دعا کر رہا ہے کہ آپ نہ جائیں۔"

"کیوں؟" اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے۔

"بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ مجھے۔ کبھی آپ نے آئینہ دیکھا ہے؟" سدرہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میں آپ کی سی صورت شکل کی ہوتی تو خود اپنے چہرے پر فریفتہ ہو جاتی۔ کتنا خوش نصیب ہو گا

وہ گھر جہاں آپ جائیں گی۔"

"مجھے کہیں جانا نہیں ہے سدرہ۔" پیار اسنے جواب دیا۔ "اتنے دن امّی سے جدا رہی ہوں۔ اب امّی کے ساتھ گزرے گی باجی کے چلے جانے کے بعد۔ وہ کتنی اکیلی ہو جائیں گی۔ بھلا منّو اور بازل بھائی سے ان کا جی بہلے گا۔ منّو سارا دن کھیل میں لگا رہتا ہے۔ بازل بھائی پڑھائی کے جھگڑے میں رہتے ہیں۔ امّی اکیلے پن میں کتنا گھبرائیں گی۔ یوں بھی اختلاج رہتا ہے انھیں۔ اب تو تنہائی کھا جائے گی امّی کو۔"

"ارے یہ تم دونوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیوں بنا رکھی ہے۔" شمیمہ نے دفعتاً انھیں للکارا۔ "سدرہ تم تو دلہنوں کا میک اپ کرنے میں ماہر ہو۔ اب الگ تھلگ کیوں جا بیٹھی ہو۔ آکے سنوارو اپنی الماس باجی کو۔"

"ہائے دوسری دلہنوں کو سجا سنوار کر دکھیا تو رہو چکی ہے۔" نادرہ نے سینہ تھام کر کہا۔ "اس کے اپنے کلیجے پر سانپ لوٹتے ہوں گے۔ دل میں سوچتی ہو گی۔ یہ سب کا سنگھار کرتی آئی ہے۔ اس غریب کے سنگھار کا وقت کب آئے گا۔ اسی مارے تو جلی بھنی سی الگ جا بیٹھی ہے۔"

"اتنی ساری محنت کی منا طائیں الماس باجی کے چمٹی ہیں جیسے مصری کی ڈلی پر کالی پیلی چیونٹیاں۔" سدرہ نے بدلہ لیا۔ "اب میری کیا ضرورت ہے۔ اچھی طرح دلہن کا میک اپ کرنا بیگم صاحب سے سفارش کر کے مٹھائی کھانے کے لئے آٹھ بارہ آنے زیادہ دلوا دوں گی۔"

"آئی وہاں سے حاتم کی نانی بن کے۔" افشاں کی ڈبیہ سدرہ پر پھینک کر نجمہ نے کہا۔ سدرہ پہ گر کر افشاں کی ڈبیہ کھل گئی۔ اور اسے سر سے پاؤں

تک سرخ افشاں نے جگمگا کر رکھ دیا۔ سب ہنس پڑیں۔ سدرہ بوکھلا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہائے بدتمیز۔ یہ کیا کیا تو نے۔" وہ اپنا لباس جھٹکتی ہوئی بولی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پسیجے ہوئے ہاتھوں میں افشاں یوں چپک گئی کہ کسی طرح چھڑائے نہ چھوٹی۔

"چل نجمہ کی بچی۔ اب نکال دے مجھے اچھے والے کپڑے۔" سدرہ نے نجمہ کی پیٹھ پر گھونسہ جما کر کہا۔ "کیا کہیں گی امی۔ اب باہر کیسے نکلوں گی میں۔ شیطان کی خالہ۔"

"ارے بی اپنی بھانجی تو میں نے تمھیں کبھی نہیں کہا۔" نجمہ بولی۔ دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ دونوں ایک دوسرے پر پھیلی پڑ رہی تھیں گدگدیاں کر رہی تھیں۔ عجیب سی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ کہ الماس تک چہرے سے آنچل سرکا کر ان کا تماشہ دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ یکبارگی اختر بول اٹھی۔ "ہائے دیکھو خالہ جان اور پھوپی اماں آ رہی ہیں۔" سب سمٹ گئیں۔ الماس نے چہرے پر آنچل سرکا کر سر جھکا لیا۔ اور بیچاری سدرہ نے اپنے دوپٹے میں خود کو لپیٹ لیا۔ خائف نظروں سے خالہ جان کو دیکھنے لگی وہ بڑی غصہ ور تھیں۔ لڑکیوں کی اونچی آواز ان کی مسکراہٹ تک برداشت نہیں کرتی تھیں۔ قدامت پسند لڑکیوں پر ان کی جان جاتی تھی۔ اسی طرح ترقی پسند اور فیشن ایبل لڑکیوں سے انھیں نفرت تھی۔ سدرہ بیچاری آہستہ آہستہ اپنے کپڑے جھٹک رہی تھی۔ اور قہر آلود نظروں سے نجمہ کو بھی گھورتی جا رہی تھی۔ نجمہ کا یہ حال تھا کہ ہنسی ضبط کرتے کرتے اسکے سینے میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ سدرہ

کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

خالہ جان اپنے دس من وزن سمیت دلہن کے پلنگ پر بیٹھتی ہوئی گرجدار آواز میں غرائیں۔

"جب سے بارات آئی ہے دلہن کے پاس گھسی بیٹھی ہو تم سب کی سب مگر سوائے حلق پھاڑنے اور نگوڑی بے بات کی بات پر دانت نکالنے کے سوا کیا کیا ہے۔ ارے لڑکی کو کپڑے تک تمہیں پہنانے۔ وہی پانچ دن کے مانجھے کے کپڑے لادے بیٹھی ہے۔ تمہارا یا بھلا ہے کہ نہیں۔"

"جی۔ ابھی پہناتے ہیں خالہ جان۔" سلیمہ نے سہم کر کہا۔ "ہم نے سوچا کہ پہلے آپ سے پوچھ لیں۔"

"ارے تو چلئے آپا جان۔ ہم یہاں سے چلیں۔" پھوپی جان نے لڑکیوں پر ترس کھا کر کہا۔ "ہمارے سامنے دلہن خود بھی نہ پہن سکے گی۔ ابھی تو رخصتی میں بڑی دیر ہے۔ تب تک یہ لوگ لڑکی کا سنگھار کر دیں گی۔ اٹھیے آپا!"

"کرنا کیا ہے؟" فرحانہ نے دزدیدہ نظریں خالہ جان پر ڈال کر کہا۔ "سسرالی لباس ہی تو دلہن پہنے ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ سسرالی بہنیں آکر میک اپ کریں گی۔"

"کیا؟" خالہ جان کی آواز حلق کے بل نکلی۔ "یہ زرد لباس سسرالی ہے۔"

"جی۔" فاخرہ بولی۔ "دولہا بھائی کی امی کو یہی رنگ پسند ہے۔ ان کے ہاں سُرخ رنگ سزاوار نہیں۔"

"ارے ہٹو۔" پھوپی جان نے بھی حیرت سے کہا۔

"سچ پھوپی جان۔ ہم جھوٹ کیوں بولیں گے۔" نجمہ نے کہا۔ اور پھر دفعتہ اس کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے دیکھا کہ سدرہ سر سے پاؤں تک چمکدار

بنی ہوئی ایک ہوئی سی لڑکی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ خالہ اماں اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھیں۔ سدرہ کو دقت تھی کہ کہیں اٹھتے اٹھتے ان کی نظر اس پر نہ جا پڑے۔ مگر ہونی تو ہو کر رہتی تھی۔ خالہ جان بھلا گت ناتی سے نہ سنا کہاں برداشت کرتیں۔ انھوں نے اس کی نگاہوں کی مطابقت میں ادھر ہی دیکھ لیا۔ جدھر سدرہ تھی اور جو نیز روشنیوں میں یوں الگ رہی تھی کہ جیسے ستاروں کے ہجوم میں گھر گئی ہو۔ سر، چہرہ، ہاتھ، باہیں سب چمکدار۔ چنانچہ خالہ جان کا پارہ حیرت جانے کہاں پہونچا۔ اچھلنے کی کوشش میں تھلتھلا کر رہ گئیں۔ پھر بے چاری سدرہ کی خبر لے ہی لی۔

”لڑکی تو ابھی بالشت بھر کی ہے۔ زمین سے ابھری نہیں۔ ابھی گئے سال تک میرے آنگن میں رسی اچکا کرتی تھی۔ آج کچھے موئے فیشن کا ایسا بھوت چڑھا کہ سر سے پاؤں تک دلہنوں کی سی چھکا چھک لال لال افشاں میں چمک رہی ہے۔ بہت سے بہت ارمان اٹھا تھا مانگ پر چھڑک لیتی۔ قسم لے لو کہ آج تک اس طرح کپڑوں اور نگوڑے ہاتھ منہ افشاں سے لیپتے کسی کو نہیں دیکھا۔ ٹھہر جا ابھی تیری اماں سے کہتی ہوں کہ اولاد کے چھوٹے اور دلارے ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ جو چاہیں مراد مارہ فیشن کریں لگام دے دیں باد اکی ناک میں اماں نگوڑی کی اوقات ہی کیا۔ اسے تو دھجی سمجھ کر آج کل کی چھوکریاں گھوڑے پہ پھینکتی ہیں۔ وہ جا۔ بجا رہی ہوں۔“

ایک تو ان کی تھانیداروں کی سی لال لال آنکھیں۔ دوسرے بھونپو کی سی آواز۔ تیسرے ان کا اچانک اس پر برس پڑنا۔ ایک قہر تھا۔ بجلی تھی۔ جو غریب سدرہ پر گری تھی۔ پہلے ہی مادر روہانسی ہو رہی تھی۔ یکبارگی رو

پڑی۔ دوسری لڑکیوں کو تو سکتہ ہی ہو گیا۔

پھوپی جان انھیں بمشکل گھسیٹ لے گئیں۔ اور اکیلے میں بدحواس ہو کر وہ سب سدرہ پر اُمڈ پڑیں۔ کسی نے اسے پانی پلایا کسی نے جلدی جلدی اس کے منہ ہاتھ پیر دھلائے۔ نجمہ جو فساد کی جڑ تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور سر جھکا کر بولی۔

"جیم جیم جی۔ آواز دو اب کسی اور جلاد کو۔ ملزم کا سر قلم کر دے۔ ارے ہم میں ہزار طرح کے مذاق ہوتے ہیں۔ خالہ اماں کو اللہ میاں کے شکر کا سا دبلا پتلا کر دیں۔ وہ آخر سینگ کٹا کے ننھی منی بکریوں کے جھنڈ میں گھس کیوں پڑیں"۔

"کپڑے لا کے دے مجھے دوسرے" سدرہ چیخی۔ "جو سب سے اچھے ہوں ورنہ قسم سے یہی تن پر کے اتر دالوں گی۔ بڑھی کی جھڑکیاں کھلوادیں پڑ گئی کلیجے میں ٹھنڈک۔ اب ادھر آگ بگولہ بنی بیٹھی ہوں گی ان کی بھی سننا ہے۔ میں نہیں رہتی یہاں جا رہی ہوں"۔

نجمہ سدرہ سے لپٹ گئی۔ اور اسے اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں کھینچ لے گئی۔ خدا خدا کر کے آفت تھمی۔ اور لباس تبدیل کر کے پھر وہ سب کے ساتھ دلہن کے پاس آ بیٹھی۔

اتنے میں الماس کی نندیں اور سسرالی رشتہ دار لڑکیاں اس کا میک اپ کرنے کمرے میں آ گئیں۔ ان کے ساتھ ایک دو شوخ خواتین بھی تھیں۔ لہذا لڑکیاں ادھر ادھر سمٹ گئیں۔ سدرہ ایک طرف کرسی کھینچ کر زہرہ کے پاس جا بیٹھی۔ اور بے اختیار اس کی زبان پر پیارا کا ذکر آ گیا۔ اب وہ کمرے میں نہیں تھی کسی نے اسے آواز

دے لی تھی۔ سدرہ اور زہرہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں۔ سر ملا کے
زہرہ نے کہا۔ "ایک تم ہی کیا۔ میں نے تو سب ہی کو دیکھا کہ آنکھیں پھیلا
پھیلا کر اسے گھور رہے تھے۔ سچ مچ حسن تو ختم ہے اس پر۔ کتنی معصوم
لگتی ہے۔ مجھے تو اس کی مسکراہٹ اتنی پسند ہے کہ اندازہ نہیں لگتا جب
کبھی روتی ہوگی تو کیسی لگتی ہوگی۔ سنا ہے حسن گریہ کہاں کچھ اور ہی ہوتا ہے۔"
"ارے کیوں بدفال منہ سے نکال رہی ہو۔" سدرہ بولی۔ "اس کے دشمن روئیں
بچی زہرہ۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اسے اپنی بھابی بنا دوں۔ امی چھ مہینے
سے بھائی جان کے لئے یہاں وہاں لڑکیاں دیکھتی پھر رہی ہیں۔ ایک دو
اچھی بھی دکھائی دیں مگر سچ مانو کوئی بھی نثار کے قدموں کے برابر بھی نہ
تھی۔ میں تو بھائی جان سے فدا ہو گئی ہوں۔ اس پر۔ اب تک نظر ہی نہ آئی
آج اتفاق سے الماس باجی کی شادی میں نہ آتے تو آج بھی نہ دیکھتے۔ اب
میں امی کو کل ہی پرسوں بھیجوں گی کہ یہاں بھائی جان کا پیغام دے دیں۔ ورنہ
ہو سکتا ہے کوئی اور اسے اچک لے جائے۔ تم کب سے جانتی ہو اسے؟"
"یہاں وہ رہتی ہی کہاں ہے۔" زہرہ نے کہا۔ "دو سال پہلے آئی تھی عید
کے موقع پر۔ اس کے چچا چچی ساتھ تھے۔ بمشکل ایک ہفتہ یہاں رہی تھی۔
پھر ان لوگوں کے ساتھ ہی چلی گئی۔ میں بھائی صاحب کے ساتھ انگریزی
پڑھنے آتی تھی۔ تبھی اس سے دوستی ہوئی تھی۔ دنوں میں میری دوست بن
گئی تھی۔ میں بھی اسے چاہنے لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اس کی بہت
یاد آئی۔ پھر دو سال بعد اب ملنا ہوا ہے۔"
"دوست تو میری بھی بن گئی ہے۔" سدرہ ہنس کر بولی۔ پھر پوچھا۔ "مگر
یہ اتنی پیاری سی بچی کو اس کے والدین نے خود سے جدا کیوں کر رکھا ہے۔"

انھیں اس کی جدائی محسوس نہیں ہوتی۔ یاد نہیں آتی اپنی بچی۔ حد ہے۔"

"ارے اس کے چچا چچی اسے کم چاہتے ہیں کیا۔" زہرہ نے کہا۔ "صحیح معنوں میں اس پر جان دیتے ہیں۔ اصل میں وہی اس کی جدائی سہ نہیں سکتے ورنہ انکل نے تو کئی بار زور دیا کہ اب لڑکی بھیج دیں۔ وہ نہ مانے دلگرفتہ ہو گئے۔"

"اچھا شاید یہی وجہ ہے کہ انکل ہمیشہ اتنے گم صم اور اداس رہتے ہیں۔" سدرہ نے کہا۔ "بات بھی ہے افسردگی کی۔ الماس باجی کی شادی ہو چکی۔ بڑے بھیا جو برسوں سے لندن میں ہیں۔ تو آنے کا نام نہیں لیتے۔ اب ان کے گھر میں رہ کون گیا ہے۔" "بازل بھائی اور منو تو ہیں۔" زہرہ بولی۔

"ان کا کیا ہے۔ بازل بھائی زیادہ محفل پسند نہیں۔ اپنے کمرے میں رہتے ہیں۔ شیطان کی نہ ہو۔ وہ گھر میں ٹکتا کب ہے۔ آنٹی کے لئے تو لڑکیوں کا ساتھ ضروری ہے۔ الماس باجی اور پیارا کے چلے جانے کے بعد کتنی تنہا ہو جائیں گی۔ یہ بازل بھائی کی شادی کیوں نہیں ہو رہی ہے۔"

"اب سے دو سال پہلے ہی ہو جاتی۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "مگر ان سے المیہ وابستہ ہے۔ تمھیں کچھ معلوم ہے۔"

"نہیں تو۔!"

"ایم۔ اے میں ان کی ایک کلاس فیلو بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اس سے منگنی تک ہو چکی تھی۔" زہرہ نے کہا۔ "وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انتظار صرف اتنا تھا کہ ایم۔ اے۔ کے امتحانات ہو لیں۔ تو شادی ہو جائے۔"

"پھر ۔۔۔ ؟"

"ارے بڑا غمناک حادثہ ہو گیا۔ سدرہ۔" زہرہ آہ بھر کر بولی۔ "وہ لڑکی اپنی شادی کے سلسلے میں شاپنگ کرنے بازار گئی تھی۔ واپسی میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس کے آٹو رکشے سے ایک ڈبل ڈیکر کی ٹکر ہو گئی۔ ڈرائیور تو چکنا چور ہو ہی گیا تھا اس لڑکی کا حال یہ ہوا کہ صورت پہچانی نہ گئی۔ مر گئی غریب شادی سے چند ہی دن پہلے۔ پھر بازل بھائی نے شادی کا سامان، ملبوسات، فرنیچر اور بھی بہت کچھ نذر آتش کر دیا۔ انھیں اتنا غم ہوا کہ اس کا اثر جوں کا توں ان کے دل پر قائم ہے۔ دو سال گزر چکے ہیں۔ پھر نہ انھوں نے کسی کو اجازت دی کہ ان کی شادی کا ذکر کیا جائے۔ نہ کسی نے بات چیت ہی چلائی۔ تبھی سے وہ بیچارے گوشہ نشیں اور خاموش ہو کر صرف اپنے کمرے میں ملازمت کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ کم سخن، خاموش، مظلوم سے بے چارے۔"

"اللہ انھیں خوشیاں دے۔" بڑے خلوص سے سدرہ نے کہا۔ "سچ مچ بھولنے والا واقعہ نہیں ہے مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ صبر کرنا اور دوسرے مشاغل میں دل کو لگا کر کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے کا بہانہ تو ڈھونڈنا ہی پڑتا ہے تمھیں یاد نہیں۔ دادی اماں کے اچانک مر جانے کے بعد میں کتنی پاگل ہو گئی تھی۔ مگر ابا نے سمجھایا کہ اس طرح تو اپنی صحت متاثر ہوتی ہے۔ حاصل کچھ نہیں۔ اگر آنسو بہانے سے کوئی جانے والا واپس آتا تو لوگ آنسو بہا بہا کر مرحومین کو واپس بلا لیا کرتے۔"

"دادی اماں کی بات اور ہے بہن۔" زہرہ بولی۔ "اور اللہ کے فضل سے نوے سال کی ہو کر پرنانی پر دادی بن کر گزری تھیں۔ ان کی موت پر آنسو بہانا صرف موت کی وحشت اور دہشت کی بنا پر تھا۔ مگر بیس اکیس سال کے

کی خوبصورت تعلیم یافتہ اور نوجوان لڑکی کی حادثاتی موت بے شک ایک بڑا المناک حادثہ ہے۔"

"اوہ۔ یہ لوگ دلہن کو باہر لا رہے ہیں۔" دفعتہً سدرہ بولی۔ "ہم نے باتوں میں وقت لگا دیا۔ اب آرسی مصحف ہو گا شاید۔ رخصتی کا وقت قریب ہے۔ چلو۔ چلیں۔"

دولہا جب اندر آیا۔ تو اس کے ساتھ چند دوست بھی تھے۔ ان میں الماس کے بڑے بھائی بازل محمد کو دیکھ کر سدرہ کو بہت تعجب ہوا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ وہ دولہا کے دوستوں میں ہوں گے۔ بڑے کم سخن، گوشہ نشین اور آدم بیزار انسان مشہور تھے۔ انتہا سے زیادہ سنجیدہ۔ حد سے زیادہ کم گو۔ ایک تنہائی پسند انسان کے طور پر سدرہ انھیں کچھ کچھ یونہی سا جانتی تھی۔ لیکن زہرہ کی زبانی ان کے بارے میں جان کر سدرہ انھیں بڑی ہمدردی سے دیکھنے لگی۔ اس وقت بھی وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑے تھے۔ اس شور ہنگام سے ذہنی طور پر بڑی دور۔ شاید انھیں خیال آ رہا تھا۔ کہ اگر ان کی زندگی ایک حادثے سے دو چار نہ ہوئی ہوتی تو یہی پُر مسرت دن ان کی زندگی میں بھی آ سکتا تھا۔ نجانے ان کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ خواہ مخواہ سدرہ ان کے المناک محسوسات اپنے دل پر سے گزارنے لگی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ یہ خوبرو، سنجیدہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کیا اس حادثہ پر اپنی منگیتر کی لاش پر رو دیا ہو گا۔ ابھی اسے سنا تھا کہ حسن گریہ کناں زیادہ پُرکشش اور مسحور کن ہو جاتا ہے اور تب بھی جب بازل اپنی منگیتر کے مرنے پر رونے لگے ہوں گے۔ تب بھی ایسے ہی خوبصورت اور جاذب نظر لگے ہوں گے۔ اس نے انھیں نظر دو

نظروں میں سراہا تھا۔ وجیہہ و شاندار، متانت کا پیکر، جامہ زیب، سرمئی شیروانی، کلی سے سفید پاجامے اور سیاہ ٹوپی میں کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ گہری سنجیدگی نے ان کے مردانہ حسن اور دلکشی میں کچھ زیادہ ہی کشش اور جاذبیت پیدا کر دی تھی۔

وہاں دولہا کے ساتھ مذاق ہو رہے تھے۔ الٹی سیدھی رسمیں کی جا رہی تھیں۔ اور جس طرح بیزاری سے سدرہ وہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ بیزاری اور اکتاہٹ بازل محسوس کر رہے تھے۔ رہ رہ کر انکی نظریں دولہا دلہن کے مرصع سہیروں پر پڑ کے اچٹ جاتیں اور ادھر ادھر ہونے لگتیں۔ ایک بار ان کی نگاہیں پل بھر کے ہزارویں حصے پر سدرہ پر بھی پڑی تھیں۔ وہ نگاہیں تو کہیں اور پلٹ گئیں مگر ایک بجلی سی سدرہ کے بدن میں دوڑا گئیں۔ اس نے محسوس کیا کہ انکی آنکھیں غیر معمولی حسین اور خوشنما تھیں۔ پیارا کی سی حور کے بھائی کو بھی تو خوبصورت اور شاندار تو ہونا ہی تھا۔ اسنے انکی آنکھوں میں پیارا کی آنکھوں کی مشابہت دیکھی تھی۔ وہ تو یوں بھی لاکھ جان سے پیارا پر فدا ہو چکی تھی۔ اب اسکے غمزدہ دلگرفتہ اور مظلوم و محروم نصیب بھائی کی محبت بھی اس کے دل میں ایک ننھے سے چراغ کی لو کی طرح دمکنے لگی۔

وہ سوچنے لگی۔ کیا کر سکتی تھی وہ اس بدقسمت انسان کے لئے۔ خدا نے اسے ایک دکھتا ہوا احساس اور جذباتی دل عطا کیا تھا۔ اب وہ دل زیادہ ہی دکھنے لگا تھا۔ اس نے سوچا۔ اس کا تو ہمیشہ سے کبھی نہ کسی موقعہ پر احمد صاحب کے ہاں آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن وہ یہاں چونکہ کسی سے بے تکلف نہیں تھی۔ کوئی ہم عمر اس کا یہاں

نہیں تھا۔ الماس اس سے بڑی تھیں۔ وہ لڑکیوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ پیارا کا تب کوئی وجود ہی سدرہ کے لئے نہ تھا۔ اس نے بس سرسری انداز سے یونہی بازل کو دیکھا تھا۔ مگر ان سے بے تکلفی اور ملنے ملانے کا تو کوئی سوال نہ تھا۔ ایک مٹّو تھا۔ اس سے کچھ بھی جھوٹ مارہا ہو گا۔ مگر وہ بڑا کھلنڈرا شریر اور نٹ کھٹ سا تھا۔ سدرہ اور وہ دونوں اکثر لڑتے جھگڑتے تھے۔ لہذا سدرہ اس کے منہ بھی نہیں لگتی تھی۔ لہذا جب کبھی بیگم یا دیگر کسی تقریب میں یا یونہی احمار صاحب کے گھر آتیں۔ تو سدرہ ان کے ساتھ آنے کتراتی تھی۔ اور اسی لئے اس نے کبھی اس گھر کے مکینوں کو قریب سے دیکھا بھی نہ تھا۔ صرف بیگم احمار الماس اور مٹو ہی سے واقف تھی۔ اب اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وہ یہاں آیا کرے گی۔ مگر کس لئے۔ کس کی خاطر۔ دل نے ایک جھوٹا جواب دیا۔ پیارا کے لئے۔ مگر وہ آپ ہی آپ جھینپ گئی۔ دل کا جواب اسے شرمندہ کر رہا تھا۔ وہ تو کسی اور کی خاطر یہاں آنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے اپنے خیالوں سے چونک کے دیکھا بازل وہاں نہ تھے۔ اور رخصتی ہونے والی تھی۔ ایک عجیب سی بے کیفی اس پر مسلط ہونے لگی تھی۔ اب وہاں پیارا بھی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ شاید الماس کے پاس تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی وداعی کا متاثر کن منظر دیکھے۔ لہذا وہ دلہن کے کمرے کی طرف جانے کی بجائے قمقموں کی کم روشنی بالکونی میں نکل آئی اور دور عمارتوں میں جھلملاتی رنگ برنگی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔

رات کے دو بجتے بجتے گھر میں سناٹا چھا گیا۔ دلہن کی رخصتی کے بعد گھر کا حال ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے کسی ہنستے بولتے آدمی نے دفعتاً دم توڑ دیا ہو۔

روح کو ڈسنے والا سناٹا، اداسی، تھکن، اضطراب، بہت کچھ گھر والوں پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ لہٰذا اب بھی بڑے دالان میں قریبی عزیز بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ بیگم یاور سے احمد صاحب کی بیوی کی خاصی دوستی تھی۔ چنانچہ وہ بھی یہیں رک گئی تھیں۔ ملازمہ نے یہیں چائے پہونچا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بار ابھی تھی۔ وہ چپکے سے احمد صاحب کے پہلو میں جا بیٹھی۔ سدرہ نے دیکھا کہ احمد صاحب کے چہرے پر ایک عجیب سی محبت کا نور پھیل گیا تھا۔ انھوں نے اس کے کندھوں کے گرد اپنے بازو سے حلقہ کر کے اسے اپنے وجود سے چپٹا لیا تھا۔ اور احمد صاحب کی بیوی بھی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی تھیں۔

سب چائے پی رہے تھے۔ سدرہ کو امید تھی کہ وہاں بادل بھی آئیں گے۔ مگر نہ وہ آئے نہ کسی نے ان کا ذکر کیا۔ سدرہ کو ان سب کی لاتعلقی کچھ غیر فطری سی لگی۔

"مغرب کے وقت یوسف اور آمنہ کے تار ملے تھے۔" احمد صاحب نے کہا۔ "یوسف نے اٹلی سے بھیجا ہے۔ لکھا ہے ابھی نہیں آسکتے۔ اور آمنہ نے لکھا ہے کہ ان کا آنا بھی ممکن نہیں۔ خط تار کے ساتھ روانہ ہے۔ مگر پیار اکو بھیج دیا جائے۔" انھوں نے ایک گہری سانس لی اور اور تار نکال کر یاور صاحب کو دے دیئے۔

"مجبوریاں ایسی بھی ہوتی ہیں بھائی۔" تاروں پر نظریں دوڑا کر یاور صاحب نے کہا۔ "ورنہ کہاں ممکن تھا کہ یوسف صاحب میری بھتیجی کی شادی میں نہ آتے۔ آخر یہ ان کے کھیتوں کا مقدمہ کب ختم ہوگا۔"

بیچاری آمنہ بہن اکیلی عدالت اور وکیلوں کی جھنجھوٹیوں سے کس طرح

مقابلہ کرتی ہوں گی۔"

"یوسف کے بیرسٹر بہت مخلص آدمی ہیں۔" احمد صاحب نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایسے آدمی اور بھر دو۔ وہ بیرسٹر صاحب آمنہ کو ان کاموں میں الجھنے ہی نہیں دیتے۔ سب کچھ خود ہی کر لیتے ہیں بہت شریف اور قابل شخص ہے۔"

"تو پھر آمنہ بہن کے آنے میں کیا حرج تھا۔" بادر صاحب کی بیوی نے پوچھا۔

"بھابی بات یہ ہے نا کہ لاکھوں کی جائداد کا کیس ہے۔ بیٹی پر اصلی مدعی کو تو حاضر رہنا ہی پڑتا ہے۔ وہ خود بھی بے چاری عاجز ہیں۔ ایک دفعہ کہہ رہی تھیں کہ میں نے ہاتھ دھوئے لاکھوں سے بھی کروڑوں سے بھی۔ میرے لئے حق حلال کی یہی بہت ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ بزرگوں کی خون پسینے کی کمائی ٹھنڈے دل سے غاصبوں کے حق میں چھوڑی بھی تو نہیں جا سکتی۔" احمد صاحب نے کہا۔ "اب میں سوچ رہا ہوں کہ جاؤں گا بنگلور اور جلد فیصلہ کروا دوں گا۔ کم ظرف، بے ایمان۔ نصف نصف ہی پر راضی ہو جائیں تو لعنت بھیج دوں اس مقدمے پر مسلسل چھ سال سے چل رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ!"

دفعتہً سدرہ بول پڑی۔ "اچھا بابا۔ اگر آمنہ آنٹی نے خط میں لکھ دیا کہ ثیارا کو بھیج دو۔ تو کیا آپ بھیج دیں گے۔" ثیارا بھی چونک کر احمد صاحب کو دیکھنے لگی۔

احمد صاحب کے پورے چہرے پر ایک عجیب سی حزنیں مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہاں بیٹی! کچھ مراسم ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا خیال اپنے دماغ

کے فیصلے اور ارادوں کی مرضی کی پرواہ کئے بغیر کرنا پڑتا ہے۔ اب وہ
اس قدر چاہتی ہیں اسے۔ اس کے بغیر ان کا دل نہیں لگتا۔ ان کی بات
کا لحاظ رکھنا ضروری ہے نا بیٹی۔"

"نہیں چچا بابا نہیں" سدرہ نے مچل کر کہا۔ "اب آپ پیارا کو کہیں
مت بھیجئے۔ ان کے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔ پیارا میری اتنی پیاری دوست
بن گئی ہے۔ ہم دونوں اب ساتھ رہیں گے۔ آپ آمنہ آنٹی کو لکھ دیجیے
کہ بیرسٹر صاحب کے سپرد کر دیں اپنا مقدمہ۔ اور وہ خود یہاں آجائیں۔
پیارا وہاں نہیں جائے گی۔ چچا ابا اب تو الماس باجی بھی چلی گئیں۔ یہ
بھی چلی جائیں گی تو کیا آپ کا دل نہیں گھبرائے گا۔"

"ضرور گھبرائے گا بیٹی" احمد صاحب بے چارگی سے بولے۔ ان
کی یہ کیفیت سدرہ کو عجیب لگی تھی۔ کیوں تھے وہ اتنے مجبور۔ ان کے صرف
دو ہی لڑکیاں تو تھیں۔ مگر دونوں ان سے دور۔ لڑکوں کا کیا۔ ایک صاحب
برسوں سے لندن میں مقیم تھے۔ وہاں وہ کسی بڑے عہدے پر تھے۔ مگر اپنے
عہدے اور لندن کے ماحول میں رہ کر انھوں نے وطن کی آب و ہوا کو
فراموش نہیں کیا تھا۔ ہر ماہ پابندی سے نہایت ہی سعادت مندی سے مفصل
خط لکھتے تھے۔ ہر ماہ پابندی سے احمد صاحب کے لئے پانچ ہزار روپے
آجاتے تھے۔ دس بارہ سال گزر چکے تھے مگر انھوں نے کسی ماہ اپنے
اصول میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ ویسے احمد صاحب بھی چیف انجینئر
کے عہدے سے حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے۔ انھیں ہر آسائش
کی ساری سہولتیں میسر تھیں۔ ذاتی مکان تھے۔ جن کے کرائے
ملتے تھے۔ جس کوٹھی میں خود رہتے تھے وہ بھی بڑی خوبصورت

تھی۔ انھیں ایک معقول ترین پینشن ملتی تھی۔ اسکے علاوہ بازل بھی اپنی ساری تنخواہ اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے کسی کو پتہ نہ تھا کہ ان کا ذاتی خرچ کیا تھا۔ اور وہ کہاں سے پورا ہوتا تھا۔ وہ مقامی جونیر کالج میں ریڈر تھے۔

ان کا طرز زندگی عجیب تھا۔ گھر میں ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ باہر کے کمرے میں رہتے تھے۔ ان کا ذاتی ملازم ان کا کھانا چائے باہر ہی پہنچا دیتا۔ شاذ و نادر ہی اندر آتے تھے۔ ان کی کم گوئی اور سنجیدگی سے چونکہ سب واقف تھے۔ لہذا ان کے ذاتی معاملات میں کوئی زیادہ دخل نہ دیتا تھا ویسے احمد صاحب اور بیگم احمد کے پاس جاتے۔ ان کی خیریت پوچھتے کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ ہمت کسی کی بھی نہ پڑتی کہ ان سے شادی بیاہ کے معاملے میں بھی گفتگو کریں ان کی زندگی عجیب سی بے کیف تنہا اور اداس تھی۔ زندگی کی گاڑی جو بے مقصد بے منزل شام و سحر کی سیاہ و سفید پٹریوں پر رواں دواں تھی۔

تیسرا منیر تھا۔ منہ بولا سترہ سال کا نٹ کھٹ لاابالی بے پروا سا لڑکا۔ اس کا شمار خطار ہی تھا۔ اس کے بے فکر چند اس کے دوست بھی تھے۔ جنت ہی گھر رہتا تھا۔ انٹر سال دوم میں پڑھتا تھا۔ اسے گھر بار کی کیا فکر تھی۔ وہ خود ماں باپ کی محبت اور توجہ کا محتاج تھا۔

تو اس طرح الماس اور دلدار کے چلے جانے کے بعد احمد صاحب اور ان کی بیوی صفیہ بیگم تنہا رہ جانے والے تھے۔

دلدار کی روانگی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ تو صفیہ بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہارا کیا جی چاہتا ہے بیٹی! یہاں رہنے کا؟ یا انچی

چچی کے پاس جانا چاہتی ہو ـ؟"

"معلوم نہیں امی!" وہ سادگی سے بولی ـ "میرا جی تو یہی چاہتا ہے ـ یہاں بھی رہوں اور وہاں بھی ـ چچی جان کا دل دکھانا ـ انھیں آزردہ کرنا بھی تو اچھا نہیں امی ـ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں ـ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ـ جو آپ لوگوں کی مرضی ہوگی ـ میں وہی کروں گی ـ"

"جزاک اللہ بیٹی!" بابور صاحب نے کہا ـ "تم بہت سعادت مند ہو ـ بے شک تمھارا یہی فیصلہ مناسب ہے ـ میرا کہا اگر مانو تو تم علیگڑھ ضرور جاؤ ـ اور یہی ٹھیک بھی ہے کہ آتی جاتی رہو ـ اس طرح یہاں بھی رہو گی اور وہاں بھی ـ اور کسی کی آزردگی کی وجہ بھی نہ بنو گی ـ"

"جی!" وہ بہت جھجکتے سے مسکرا کر بولی ـ اور سر جھکا لیا ـ اس کے اس طرح راضی برضا ہونے سے سدرہ حیران بھی ہوئی ـ اور خجل بھی ہوگئی ـ وہ اتنی سعادت مند اور فرمانبردار نہ تھی ـ دو بڑے بھائیوں اور ایک بڑی بہن کی سب سے چھوٹی بہن تھی ـ لہٰذا اس نے خود کو جان بوجھ کر ضدی اور خود سر بنا لیا تھا ـ اپنی کسی بات پر ضد کر کے منہ پھلا لیتی تھی اور بابور صاحب کو دلار کے مارے اس کی ضد پوری ہی کرنی پڑتی تھی ـ

رات کے تین بج رہے تھے ـ پچھلے پہر کا موسم خنک ہو چلا تھا ـ اُفق کے کناروں پر پُر نورِ سحر دمکنے لگا تھا ـ کہیں دور مرغ بول رہے تھے کوٹھی کا پائیں باغ چڑیوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا ـ کبھی سڑک سے کوئی سواری گزر جاتی ـ تو شب کا سکوت کچھ دیر کے لئے درہم برہم ہو جاتا ـ اب ان لوگوں کے چہروں پر بھی تھکن کے آثار گہرے ہونے لگے

تھے۔ چائے نے نیند اور تکان کا خمار کم نہ کیا تھا۔ چنانچہ احمد صاحب رہ رہ کے جمائیاں لے رہے تھے۔ اور یاور صاحب بھی اجازت کے طلبگار تھے۔

دفعتہً وہاں ملازم آیا۔ اور احمد صاحب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صاحب! وہ کوئی صاحب آئے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ اگر کوٹھی چلنا ہو تو گاڑی لے آئیں۔"

"مصطفٰے ہی ہوں گے" یاور صاحب نے کہا۔ "اچھا جناب اب اجازت دیجئے۔ انشاءاللہ پرسوں ولیمہ کے موقعہ پر ملاقات ہو گی۔"

"میں پوچھتا ہوں۔ یہ مصطفٰے اخود کو اس قدر غیر اور اجنبی کیوں سمجھتے ہیں" احمد صاحب نے کہا۔ "شاید ہی کبھی اندر آ کے ہم سے ملے ہوں۔ اب کیا وہ یہاں آ نہیں سکتے تھے۔ بڑا رنج پہونچتا ہے مجھے اس بیگانگی سے۔ یاور بھائی بلایئے انھیں یہاں۔"

"بھائی اب ہمی کو کیوں نہ اجازت دے دیجئے" یاور صاحب ہنسنے لگے۔

"ہرگز نہیں" احمد صاحب نے کہا۔ "انھیں ہم سب کے ساتھ جائے تو پینی ہی پڑے گی۔ مگر لاحول ولاقوۃ۔ معلوم تو ہو کہ باہر مصطفٰے ہی ہیں کہ میں یونہی ان پر خفا ہو رہا ہوں۔ یا ملازم کسی اور کو لے آئے۔"

یاور صاحب نے کہا۔ "وہی ہوں گے۔ اور کون آ سکتا ہے کوٹھی سے۔"

احمد صاحب نے ملازم سے کہا۔ "ان صاحب کو یہاں لے آؤ۔"

"بچیاں تو ہٹ جائیں" یاور صاحب بولے۔

"سب ان کی بہنیں ہیں۔ یہاں پردہ نشین اور اجنبی کون ہے" احمد صاحب نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ دوسرے لمحے ملازم مصطفٰے کو اندر پہونچا گیا۔

وہ کچھ محجوب سے ہوئے جارہے تھے۔

"کیوں میاں"۔ احمد صاحب نے للکارا۔ "اچھی طرح دیکھا۔ یہاں تک آتے ہوئے تمھارے پاؤں کی مہندی تو نہیں چھوٹ گئی"۔

"جناب باہر ہی تو بیٹھا تھا۔ میرے پاس بازل تھے۔ اور دو تین۔۔ حضرات اور بھی تھے"۔ مصطفٰے نے جواب دیا۔ "وہ اب گئے ہیں تو میں نے سوچا کہ شاید امّی وغیرہ بھی گھر چلیں گی"۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا"۔ صفیہ بیگم نے کہا۔ "تم بھی شادی کے انتظامات میں صبح سے مصروف تھے۔ ایک پیالی چائے پی لو۔ ہم نے بھی ابھی کچھ دیر پہلے پی ہے۔ ساتھ میں کچھ بسکٹ وغیرہ بھی لے آؤں"۔

"ارے نہیں چچی اماں۔ یہ کیا زحمت کر رہی ہیں آپ"۔ مصطفٰے نے صفیہ بیگم کو کندھوں سے تھام کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے بھی کچھ ہی دیر پہلے بازل اور اپیتار وغیرہ کے ساتھ چائے پی لی تھی۔ یوں بھی صبح ہو رہی ہے۔ ناشتے میں دیر نہیں۔ میں یہ کہنے آیا تھا کہ امّی اب گھر چلیں تو۔ گاڑی لے آؤں۔ آج مجھے ذرا جلدی ایک صاحب سے ملنے جانا ہے"۔

"اچھی بات ہے"۔ احمد صاحب نے کہا۔ "جانے کی اجازت اس شرط پر دے رہا ہوں کہ کبھی کبھی آیا جایا کرو۔ اگر آج تمھاری بہن کی شادی نہ ہوتی تو تم آج بھی نہ آتے"۔

"اب ضرور حاضر ہو جایا کروں گا"۔ وہ مسکرائے۔ "ویسے باہر تو بازل سے ملاقات ہوتی رہتی ہے"۔

سب جانے کے لئے اٹھ گئے۔

"اچھا سدرہ خدا حافظ" دفعتہً ایک نئی آواز سن کر غیر ارادی طور پر مصطفےٰ نے رُخ پھیرا۔ اور پھر یکبارگی ان کا دل دھڑکنے لگا۔ پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کون تھی وہ لڑکی۔ سورج کی شعاع۔ چاندنی ۔ اور صبح کے تارے کی مانند حسین۔

"میرے ہاں کب آؤ گی؟" سدرہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم بلاؤ گی" چاندی کے موتی بکھر گئے۔

"میں تو روز ہی بلا بھیجوں گی" سدرہ ہنس پڑی۔

جواب میں وہ بھی ہنس پڑی۔ "تو پھر میں روز آؤں گی"

دفعتہً مصطفےٰ کو احساس ہوا۔ ان کی خود فراموشی کوئی محسوس نہ کرلے۔ انھوں نے اس ملکوتی چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

صفیہ بیگم نے سدرہ سے کہا۔ "کل چوتھی ہے۔ دوپہر سے چلی آنا"
"آنٹی جی! میرا اہم پیپر کل نہ ہوتا تو میں آپ ہی کے پاس رہ جاتی"
سدرہ بولی۔

جاتے جاتے بیگم یاور نے یسارا کو سینے سے لگا کر اس کی پیشانی پر پیار بھرا بوسہ دیا۔ اور بولیں۔

"بیٹی اپنے پر سے نظر اتروا لینا۔ ماشاءاللہ کتنی پیاری ہو۔ آج جانے کس کس کی نظر لگی ہے تمھیں"

یسارا کھلکھلا کر ہنس دی۔ "خالہ امی۔ کیا میں اتنی اچھی ہوں"
جواب میں بیگم یاور نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔

گھرے مٹیالے بادل ٹوٹ کے برسے تھے۔ ہر طرف چھوٹے موٹے گڑھوں میں گدلا گدلا پانی بھرا تھا۔ گیٹ کے سامنے نشیب میں ایک جھیل سی بن گئی تھی۔ اور دو رویہ سبزہ زار کی درمیانی روش پانی میں ڈوب گئی تھی۔ یکساں رفتار سے بارش ہو کر کچھ تھمی تھی۔ مگر ترشح اب بھی جاری تھا۔ بھورے بادلوں میں رہ رہ کر بجلیاں کوند رہی تھیں۔ اور بادلوں کی گرج دل ہلا دیتی تھی۔ موسم بے حد دلفریب اور دلکش ہو گیا تھا اگرچہ یہ بارش کے دن نہ تھے۔ صرف برسات کی آمد آمد تھی۔ لیکن طوفانی بارش نے بھری برسات کی پیشین گوئی کر دی تھی۔ مصطفےٰ بڑی دیر سے برآمدے میں کھڑے پانی کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کے سامنے دور دور تک پھیلی ہوئی سڑک پانی میں ڈوبی سمندر کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اب ایک آدھ راہگیر جوتیاں ہاتھ میں پکڑے، لباس سمیٹے چھپ چھپ کرتا آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ سواریاں بھی چلنے لگی تھیں۔ بادل اب بھی تلے کھڑے تھے۔ آثار کہہ رہے تھے کہ موسلا دھار مینہ پھر برسے گا۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ بھی بادلوں کو منتشر کرنے میں ناکام رہے تھے۔ بلکہ وہ دور دور کے بادل گھسیٹ کر ایک جگہ اکٹھا کرنے کی مدد کر رہے تھے۔

آہٹ سن کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ سدرہ ننھی سی چمکیلی ٹرے میں کافی کی پیالی لئے کھڑی تھی۔

"اندر کیوں نہیں آئے آپ۔ امّی نے اتنی بہت سی آوازیں دیں تھیں!"
سدرہ بولی۔

"ایک بھی آواز میں نے نہیں سنی!" مصطفےٰ نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "مگر تم مجھے بلا لے جاتیں۔ یہاں کافی کیوں لائیں؟"

"بھائی جان آپ تو بہت بھیگ گئے ہیں" سدرہ نے ان کے سینے پر اپنے ننھے منّے ہاتھ رکھ دیئے۔ اور کھلکھلا کر ہنس دی۔ "مجھے بھی پانی کا تماشہ بہت اچھا لگتا ہے۔ امّی صحن میں نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ قمیص بدل دیجئے۔ کیا آپ یہاں کھڑے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔؟"

"نہیں!" انھوں نے جواب دیا۔ ان کے سنجیدہ ترین چہرے پر زیادہ سنجیدگی چھا گئی۔

"پھر آپ اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔؟"

"پریشان؟ نہیں تو!" انھوں نے کافی ختم کر کے خالی کپ ٹرے میں رکھ دی۔ "امّی مجھے کیوں آوازیں دے رہی تھیں۔ کوئی کام تھا۔؟"

"مجھے معلوم نہیں!"

"ابھی آتا ہوں۔ لباس تبدیل کر لوں۔"

"ایک بات آپ سے کہنے کی ہے۔ مگر ڈر لگ رہا ہے۔ آپ کہیں خفا تو نہیں ہو جائیں گے۔"

"بے خوف ہو کر کہو۔ میں کیا کبھی تم سے خفا ہوا ہوں۔"

"ہم لوگ کل شام کو ممانی اماں کے ہاں گئے تھے۔" ڈرتے ڈرتے سدرہ بولی۔ "اچھا!"

"ماموں جان نے امّی سے کہا تھا کہ۔ اگر" سدرہ رک گئی۔

"میں سمجھ گیا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو!" مصطفیٰ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"مگر سدرہ! میں تم سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے امی کا وہاں جانا قطعی پسند نہیں۔ اور تمہارا ان کے گھر میں قدم رکھنا تو اور زیادہ ناگوار ہے۔ کیا امی ماموں جان کے صاحبزادے میاں الطاف سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ یا وہ اس لئے امی کو اچھے لگتے ہیں کہ ان کے بھانجے ہیں۔"
سدرہ کا پُرکشش چہرہ ایکدم سُرخ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن ماموں جان نے آپ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ وہ معلوم ہے۔ کہ۔ اگر۔ مصطفیٰ جلد کوئی فیصلہ کر دیتے تو مناسب تھا۔ انھوں نے ریاست باجی کا سارا جہیز امی کو دکھایا تھا۔ اور کہہ رہے تھے کہ صرف پلنگ ہی گیارہ ہزار کا ہے۔"
"لاحول ولا قوۃ!" مصطفیٰ کے منھ سے نکلا۔ "پھر امی نے کیا جواب دیا؟"
"امی نے کہا کہ ابا سے تذکرہ کریں گی۔"
"ہاں۔ ہاں۔ ضرور کریں تذکرہ۔" ان کے چہرے پر غصے کی سرخی ابھری۔
"خیر تم ان فضول باتوں میں نہ پڑو۔ تمہارا رزلٹ کب ہے؟"
"ابھی تو کچھ معلوم نہیں ہوا!"
"ارے۔ یہ کس کی کار۔ ہمارے گیٹ کی طرف آ رہی ہے۔" مصطفیٰ نے دفعتہً کہا۔ "تم اندر جاؤ۔ شاید میرے کوئی ملنے والے ہیں۔"
"امی سے کہہ دوں۔ آپ آ رہے ہیں۔" سدرہ نے جاتے جاتے پوچھا۔
"چند منٹ بعد۔"
سدرہ نے ایک سرسری نظر اس کار پر ڈالی۔ جو گیٹ میں داخل ہو کر

روش پر آ رہی تھی۔ اور بڑے سنبھال کر اندر چلی گئی۔

گاڑی عین زینوں کے پاس رک گئی تھی۔ پھر شوفر نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ اور دفعتہً مصطفےٰ کی پلکیں جھپک گئیں۔ گاڑی کی پچھلی نشست سے وہ لڑکی اتری تھی جو ایک حسین مہک کی طرح ابھی تک مصطفےٰ کے دل میں بسی ہوئی تھی۔

سیدھے سادے ہلکے رنگ کے کاسنی لباس میں لپٹی وہ یوں لگ رہی تھی جیسے کاسنی رنگ کا کوئی لطیف سا ٹکڑا ابر مجسّم ہو گیا تھا۔ وہ زینے طے کر کے اوپر آئی۔ اور برآمدے میں ایک نوجوان کو کھڑے دیکھ کر ٹھٹکی نہیں۔ اس کے گلابی گلابی خوشنما لبوں پر شناسائی کی حسین مسکراہٹ بکھر گئی۔ اور اس نے حجاب سے ڈوپٹے کا آنچل سر پر اوڑھ کر بڑی سادگی سے سیدھا ہاتھ اپنی چمکتی ہوئی پیشانی پر رکھ لیا "تسلیم!" اس کی آواز بھی اتنی ہی پُرکشش اور دل موہ لینے والی تھی۔ جتنی اس کی شکل تھی۔ مصطفےٰ کا دل ایک بار بڑے زور سے دھڑک کے یوں تھم گیا۔ جیسے بے حرکت ہو گیا ہو۔

"تسلیم" آواز ابھارنے کے لئے مصطفےٰ کو چپکے سے کھانسنا پڑا۔ انھوں نے اپنی بھیجی ہوئی ہتھیلیاں آپس میں رگڑیں۔ اور ہاتھ پیچھے باندھ لئے۔

"کیا آپ نے مجھے پہچانا نہیں" وہ بولی۔

ان کو اعتراف کرنا پڑا۔ "پہچان لیا" وہ خفیف سا مسکرائے! "مگر معاف کیجئے۔ میں آپ کا نام نہیں جانتا"

"سدرہ میری سہیلی ہے" اس نے کہا۔ "اس نے میرا نام نہیں بتایا

آپ کو۔"

"جی نہیں۔ سدرہ نے آپ کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔"

"مجھے یشارا کہتے ہیں۔" سفید موتیوں کی قطار اس کے شفق گوں لبوں پر ضیا بار ہو کر معدوم ہو گئی۔

"بہت خوبصورت نام ہے۔"

وہ جھینپ کے سے ہنس دی۔ "سب یہی کہتے ہیں۔ مگر آپ سچ مانئے مجھے معلوم نہیں یشارا کے معنی کیا ہیں۔ اگر کوئی پوچھ لیتا ہے تو میں بتا نہیں سکتی۔"

"آپ کے نام کے معنی تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" مصطفےٰ تو حیران تھے۔ کتنی اپنائیت تھی اس کی بات چیت میں۔ جیسے وہ انھیں برسوں سے جانتی ہو۔ اور رہ رہ کے ان کا دل عجیب انداز سے دھڑک اٹھتا تھا۔ انھوں نے اُسے اس کی شادی کی رات اپنے دور سے بس ایک نظر دیکھا تھا۔ لیکن پاس سے وہ قیامت لگ رہی تھی۔ اتنی حسین اتنی دلکش کہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا دشوار تھا۔

"میں سدرہ سے ملنے آئی ہوں۔" اس نے کہا۔ "دیر ہوئی گھر سے نکلی تھی۔ راستے میں بارش آگئی۔ ہمارے ڈرائیور ابراہیم صاحب تو کہہ رہے تھے کہ بی جی واپس گھر چلیے۔ مگر میں کیسے واپس جاتی۔ سدرہ سے مجھے ایسا ضروری کام ہے۔ کچھ کہنا ہے اس سے۔"

"اچھا۔ اچھا۔" مصطفےٰ نے کہا۔ "سدرہ اندر ہے۔ میں اسے یہیں بلا دوں یا آپ اس کے پاس جائیں گی؟"

"نہیں نہیں۔ یہاں نہیں۔" یشارا نے ہنس کر کہا۔ "مجھے اس کے پاس پہونچا دیجئے۔ خالہ امی سے بھی تو ملنا ہے۔ امی کے سلام بھی تو مجھے

خالہ امّی کو بھی پہچانتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سلام بھی امانت ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں! سنا تو میں نے بھی ہے۔" مبہم انداز میں وہ مسکرائے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہیں کھڑی ان سے ایسی ہی معصوم سی باتیں کرتی رہے۔ اور صدیاں گزر جائیں۔ جگ بیت جائیں۔ عمر تمام ہو جائے۔

"چلئے۔ مجھے لے چلئے سدرہ کے پاس۔" اس کی گہری سیاہ دراز خوشنما پلکیں ان کی طرف اٹھیں اور مصطفٰے کا سفینۂ ایمان محبت کے سمندر میں ہچکولے لینے لگا۔

"آیئے! ضرور!" انھوں نے کہا۔ "ابھی ابھی یہیں تھی۔ میں اسے آواز دوں یا آپ کو لے چلوں اس کے پاس؟"

جواب میں نثار نے بڑی بے تکلف حرکت کی۔ نہایت اپنائیت اور معصومیت سے ان کے بازو پر اپنے چھوٹے نرم و نازک ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔ "آپ کتنے بھیگ گئے ہیں۔ کیا آپ کو بارش میں بھیگنا اچھا لگتا ہے؟" اس نے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ہتھیلیوں سے اپنے گال دبا لئے۔ اور ہنسنے لگی۔ "بارش میں بھیگنا مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ پانی بدن پر گرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قطرہ قطرہ روح کی گہرائیوں میں بھی پہونچ رہا ہو۔ مگر یہ ہماری امّی اور چچی جان عجیب ہیں۔ یہاں یہ۔ وہاں وہ۔ مجھے ایسے موقعوں پر آنگن میں نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ جہاں بادل آئے بس پڑ پڑتی ہے۔ بیٹی اندر آ... بجلیاں چمک رہی ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں۔ پانی میں نہ نہاؤ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔" اس نے اپنی ہتھیلیاں رگڑ لیں۔ اور منہ بنایا۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مصطفٰے پر

خود بھی بخار سوار ہونے لگا تھا۔ کیوں اتنی بے تکلف ہو رہی تھی یہ لڑکی۔ جان نہ پہچان۔ یہ مزاج کی سادگی ہے یا اس کی عادت ہے۔ مگر نہیں ۔! انھوں نے خود پر نفرین کی۔ بہت سیدھی سادی ہے۔ سدرہ کی سہیلی ہے۔ اس کی دوستی کی وساطت سے اگر کچھ بے تکلف ہو گئی تو اس میں اتنا بہت سا سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسے نہیں معلوم کہ وہ ایک بنجر زمین میں پیار کا ایک ننھا سا بیج بو رہی تھی۔ جسے بہر حال کونپل بن کر سر ابھارنا تھا۔ آندھیوں، طوفانوں کا مقابلہ کر کے اپنی جڑیں مضبوط کرنا اور تناور درخت بننا تھا۔ جو شاید کبھی کسی ننھی سی کونپل کی تقدیر میں لکھا نہیں ہوتا۔ کبھی کوئی سانحہ کوئی واقعہ کوئی انہونی سی بات اسے ۔۔ یکبارگی خشک کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور زمین کا وہ سینہ جس سے محبت کا نوخیز پودا نوچ کے پھینکا جاتا ہے۔ اس سینے کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس کا چاک جگر کب رفو ہوتا ہے۔ اس کے زخم کب بھرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ کوئی نہیں محسوس کرتا۔ تو پھر اس بیج کی آبیاری پذیرائی سے کیوں کی جاتی ہے؟

ابھی ابھی سدرہ انھیں ایک ناخوشگوار واقعہ سنا گئی تھی۔ مصطفےٰ نے سوچا اور ان کے سر میں چکر آ گئے۔ وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ ایک انڈسٹریل کمرشیل آفس میں بزنس منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ ان کی شخصیت مرعوب کن اور پرکشش تھی۔ خوبرو اور جامہ زیب آدمی تھے۔ لیکن ان ذاتی صفات سے علٰحدہ گھر میں بھی ان کی ایک حیثیت تھی۔ ایک خوشنما شمع کی سی جس کے گرد پروانوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ان کی ذات و صفات کو دیکھتے ہوئے تقریباً خاندان بھر کے

وہ والدین جن کے آگے بن بیاہی بیٹیاں تھیں۔ ان پر دانت رکھے ہوئے تھے۔ اس کا احساس مصطفےٰ کو بخوبی تھا۔ لیکن باوجود اس کے وہ خود مختار تھے۔ عمر کی اٹھائیس تیئیس منزلیں طے کرلی تھیں۔ وہ اپنی ماں سے اتنی بے پایاں محبت کرتے تھے کہ ان کا معمولی سا حکم ٹالنا ان کے لئے گناہ اور ان کی خفیف سی خفگی بھی ان کے لئے گناہ کبیرہ تھی۔ اور یہ سب لوگ جانتے تھے کہ مصطفےٰ کے مستقبل اور شادی بیاہ کا سارا انتظام ان کی ماں ہی کے ذمہ تھا۔ اب اتفاق یا سوئے اتفاق یہ تھا کہ یاور صاحب کی بیوی کو اپنے بڑے بھائی کی لڑکی ریاست جہاں خدا معلوم کیوں پسند آگئی تھیں۔ بھائی کی بیٹی ہونے کے ناطے یا ریاست کی کم سخنی اور کم آمیزی کی وجہ سے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں شوہر اور بیٹے کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا تھا۔ کہ ریاست ان کی بہو بن کر آجائے۔ تو پھر اسی کے بھائی سے وہ سدرہ کو بھی بیاہ دیں گی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ مقامات مقدسہ کی زیارت کا تھا۔

یاور صاحب اس رُخ پر آئے ہی نہیں تھے۔ انھیں بیگم کے بھائی اور ان کی آل اولاد سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ عجیب سی نفرت تھی جس کا اظہار کسی کے سامنے کر کے انھیں گھر میں مہابھارت برپا کرنا منظور نہ تھا۔ انھوں نے فیصلہ مصطفےٰ پر چھوڑ دیا تھا۔ اور سدرہ کے لئے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ کہ اسے خدا الطاف کی بیوی بننے سے محفوظ رکھے۔

ریاست اور الطاف کے ذکر پر بیگم یاور نے شوہر کے چہرے پر نفرت اور بیٹے کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے تھے مگر انھوں نے جان

بوجھ کر پروا نہیں کی جس طرح وہ یاور صاحب کی بڑی بہن اور ان کی ضعیف
ماں سے بیزار تھیں۔ اسی طرح وہ بھی ان کی بہن، بھائی اور بچوں سے بیزار
تھے۔ تو حساب تو برابر تھا۔ مگر مصطفےٰ کے چہرے کے ناخوشگوار۔۔
تاثرات نے انھیں ہمیشہ کے لئے فکر مند کر دیا تھا۔ وہ ان کے بے حد
چہیتے بیٹے تھے۔ وہ انھیں مثالی بنانا چاہتی تھیں۔ اور وہ مثالی بن
بھی گئے تھے۔ اور ان کی نیک نفسی، جذبہ ایثار اور خدمت، خود سے
ان کی محبت کی شدت دیکھتے ہوئے وہ بیحد فکر متفکر تھیں کہ اگر بیٹے کو
ماموں کے گھر کا رشتہ پسند نہ تھا تو انھیں مجبور کس طرح کریں گی۔ ان کی
مرضی پر اپنی مرضی لادنا ان پر سراسر ظلم تھا۔ بیگم یاور کا کیا تھا۔ انھوں
نے اپنے فرائض ادا کر دئے تھے۔ اب اولاد کی شادیوں کے بعد وہ ہر
قسم کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گی چنانچہ اپنی مرضی اور پسند اب
انھیں اتنی اہم نہیں لگ رہی تھی۔ لہٰذا اپنے بھائی کی بیٹی کو ذہن میں رکھنے کے
باوجود انھوں نے ادھر ادھر لڑکیاں دیکھی بھی تھیں۔ مصطفےٰ کو دکھائی بھی
تھیں۔ لیکن کسی پر انھوں نے صاد نہیں کیا تھا۔ پھر اچانک جیسے بجلی
کہیں چمکے اور وہیں منجمد ہو جائے۔ انھیں احمد صاحب کی بیٹی نیارا
دکھائی دی اور وہ اپنی تمام تر تمناؤں کے ساتھ اس کی گرویدہ ہو
گئیں۔ ابھی اس کے بارے میں انھیں علم نہ تھا۔ کہ وہ کسی کی منگیتر
تو نہ تھی۔ یا اس کے والدین نے اس کا رشتہ کہیں پختہ تو نہیں کر دیا تھا
جب وہ نیارا پر ہزار لاکھ جان سے فدا ہو گئیں تو انھوں نے سوچا
کہ ایک بار اور اپنے بھائی جناب شرافت حسین صاحب سے بات چیت
کر کے دیکھیں۔ اگر شرافت صاحب نے کسی قسم کی بھی بے رخی کا مظاہرہ

کیا تو وہ اپنی ذمہ داری سے آزاد ہو جائیں گی۔ اور بعد کو شرافت صاحب ہی پر الزام رکھ سکیں گی کہ انھوں نے تعلقات ختم کئے تھے۔ لیکن ان کی امیدیں منھ کے بل زمین پر آ رہیں۔ شرافت صاحب نے پرانے رشتے کو استواری اور استحکام بخشتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیشہ سے ریاست جہاں ان کی تھیں۔ اور شروع سے وہ مصطفےٰ کو اپنے داماد کے روپ میں دیکھ رہے تھے۔ یہ بات سن کر بیگم یاور کو ایسا ہی لگا تھا کہ جیسے کسی بے گناہ مجرم کو قید کی سزا سنا دی ہو۔ وہ پریشان ہو گئیں۔

ان کی فکریں تو یوں بھی ان کا بلڈ پریشر بڑھا رہی تھیں۔ اور ایک طرف سے سدرہ بھی جان لئے ہوئے تھی۔ یسارا اسے اس قدر پسند تھی کہ جب سے وہ اس سے مل کر آئی تھی۔ برابر اسی کے گُن گا رہی تھی۔ اور ماں کو مجبور کر رہی تھی۔ کہ کسی طرح ریاست کا پھندا گلے سے اتار کر یسارا کو نرم و نازک طلائی ہار کی طرح گلے کی زینت بنا لیں بیگم یاور سخت مصیبت میں تھیں۔ پچھتا رہی تھیں اس وقت کو جب وہ خواہ مخواہ بھابی کے گھر رشتے کی بات کرنے گئی تھیں۔

ان کی پریشانی اور طبیعت کا اضمحلال یاور صاحب سے چھپا نہ رہا۔ اور مصطفےٰ سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکا۔ مگر کسی نے ان سے پوچھا نہیں۔ مصطفےٰ کے دل میں ہیجان سا برپا تھا۔ کون سی بات تھی جس نے امّی کو مضطرب اور گم صم کر رکھا تھا۔ ان دنوں ان کی کیفیت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایک رات کو ایک حسین چہرہ سرسری انداز میں دیکھا تھا۔ اور وہ چہرہ ان کے لوح دل پر یوں ثبت ہو گیا تھا کہ کسی طرح مٹائے نہ مٹ رہا تھا۔ ان کی نظروں سے ان گنت نسائی پیکر گزر

چکے تھے۔ لیکن کسی نے اتنا متاثر نہ کیا تھا۔ وہ اتنے کم آمیز اور خاموش طبیعت کے سنجیدہ انسان تھے کہ ان سے کسی جذباتی بے چینی متوقع نہیں تھی۔ ان میں صبر و برداشت کی طاقت بھی بہت تھی۔!
اگر وہ اپنی خوشیوں کو قہقہوں کی آواز عطا نہ کرتے تو غموں میں بھی ان کے چہرے پر خوف و ملال کی پرچھائیاں نظر نہ آتیں۔ تب بھی لبوں پر صبر و ضبط کے تالے ہی پڑے رہتے۔

اور اب جبکہ ایشارا ان کے سامنے کھڑی تھی۔ بھولی بھالی، معصوم حسین، متبسم اور بے تکلف سی۔ تو مصطفےٰ کی عقل جواب دینے لگی تھی۔ کہ اس سے کس طرح کی گفتگو کرتے۔ وہ تو بہت سادہ اور بچکانہ مزاج رکھتی تھی۔ پہلی ہی بار کی بات چیت سے مصطفےٰ نے اندازہ لگا لیا تھا۔ کچھ دیر اگر وہ اور یونہی کھڑی رہتی تو وہ بے ضبط ہو کر اپنے کمرے میں گھس جاتے۔ ہوش و حواس پر اسی طرح مسلسل برق پاپاں ہو رہی تھیں۔

دفعتہً وہاں ملازم آ گیا۔ کچھ سودا سلف لینے بازار جا رہا تھا۔! برسات کی اوّلین بارش کا زور بھی اب کچھ کم ہو چکا تھا۔ ہلکی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ انھوں نے ملازم سے جلدی سے کہا۔

"واپس جاؤ۔ اور سدرہ بی بی سے کہو۔ انھیں میں بلا رہا ہوں۔"

ملازم واپس آیا تو سدرہ اس کے ساتھ تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلی اس کی نظریں ایشارا پر پڑیں۔ ایک پُرمسرت ہذیانی سی چیخ اس کے منھ سے نکل گئی۔

"ہائے ایشارا تم؟" وہ اس سے یوں لپٹ گئی کہ دونوں ہی لڑکھڑا گئیں۔ اگر فوراً انھیں مصطفےٰ سنبھال نہ لیتے تو وہ بھیگے فرش پر

آ رہی تھی۔

"کب آئیں! سدرہ بے اختیار مسرور کن ہنسی ہنستی جا رہی تھی۔" اطلاع کیوں نہ کی۔ ہائے بیٹا را ہیں تمہیں کتنا یاد کر رہی تھی۔ اگر اس وقت اللہ میاں سے کچھ اور مانگتی تو مل جاتا۔ مگر تمہارے سوا میں کچھ اور مانگتی بھی کیوں۔ آؤ نا۔ اندر چلیں۔ امی بھی کتنی بار تمہارا ذکر کر چکی ہیں۔"

"جا رہی ہوں۔ بے حد دلنشیں انداز میں اس نے اپنی ہوشربا آنکھیں مصطفیٰ کی طرف اٹھائیں۔ اور خواہ مخواہ ان سے اجازت مانگی۔

"ضرور جائیے۔" گھبرا کر مصطفیٰ نے کہا۔

سدرہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

مصطفیٰ نے ایک گہری سانس لی اور مڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اندر گھٹن تھی حبس تھا۔ انھوں نے پچھلی سڑک پر کھلنے والے بڑے بڑے دریچے کھول دیئے۔ اور سیلنگ فین پوری رفتار سے آن کر کے اپنے بستر پر آ لیٹے۔ ایک بڑے مشہور معروف شاعر کا کلام "سرود رفتہ" نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ مگر یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شعر کی بسیط جہاں سے بس سرسری ہی گزر رہے۔ جہاں دیکھو تو سدرہ سمیٹ لے گئی تھی۔ کتاب الٹ کر انھوں نے اپنے سینے پر رکھ لی۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ اجنبی خیالوں کا ایک مسلسل آبشار سا تھا جو نجانے کہاں سے ان کے دماغ پر گر رہا تھا۔ تلے اوپر خیالات تھے کہ جیسے ہزار دانہ ٹوٹ کر بکھر گیا ہو۔ گھبرا کر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ کتاب بند کر کے ریک میں لگا دی۔ اور اٹھ کر کمرے کی محدود وسعتوں میں ٹہلنے لگے۔

سدرہ اسے اپنے ساتھ لے کے اندر پہونچی تھی۔ سامنے ہی چھوٹے تخت پر بیگم یاور لیٹی تھیں۔ اور ان کی خاص خادمہ زیتون ان کا سر دبا رہی تھی یسارا کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔ اور اس کے سلام کے جواب میں دعائیں دیتی ہوئی بولیں۔

"بڑی خوشی ہوئی بیٹی تمھیں دیکھ کے۔ مگر اتنی بارش میں۔ اکیلی آئی ہو تم۔ اپنی امّی کو ساتھ نہیں لائیں؟"

وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے بدن سے ایک کوری کوری مہک اڑی اور بیگم یاور کے دل میں محبت بن کے پھیل گئی۔

"امّی کو اب فرصت کہاں ہے خالہ امّی" یسارا مسکرائی۔ "ابھی تو ہمارے ہاں شادی ہی کے مہمان بھرے ہیں۔ باجی کی سسرال سے کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے۔ نئے دولہا بھائی کی خاطر تواضع میں امّی ہی کو تو آگے آگے رہنا پڑتا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میرے ساتھ آپ بھی چلیئے۔ انھوں نے کہا کہ میری طرف سے بہن صاحبہ کو سلام کہنا۔ اور کہنا پھر کبھی ضرور آؤں گی اور میں۔ میں تو خالہ امّی ایک خاص التجا لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"شوق سے کہو بیٹی!" بیگم یاور نے بڑے پیار سے اس کے گال سہلا کر کہا۔

"خالہ امّی کل ہم لوگ۔ مطلب یہ کہ بیس بائیس لڑکے لڑکیاں پکنک منانے ناگر جونا ساگر جا رہے ہیں۔ آپ سدرہ کو بھی اجازت دے دیجئے۔ ہمارے ساتھ چلے۔ ادھر سے تازہ تازہ دولہا دلہن بھی آ رہے ہیں۔ کیوں خالہ امّی ہم لے جائیں نہ سدرہ کو اپنے ساتھ۔"

"کوئی بڑا بوڑھا ساتھ نہیں جا رہا ہے؟" بیگم یاور نے پوچھا۔

"بڑے بوڑھوں میں ایک تو ہمارے پرانے چوکیدار خان صاحب ہی ہیں۔ اور دوسری نانی لطیفن ہیں"۔ یشارا نے بتایا۔

"امّی۔ میں جاؤں گی یشارا کے ساتھ"۔ ٹھنک کر سدرہ نے کہا۔ اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں۔ ہاں۔ چلی جانا"۔ وہ مسکرائیں۔ "کب جانا ہے؟"۔

"جی خالہ امّی۔ بس صبح آٹھ بجے نکل چلیں گے"۔ یشارا نے کہا۔ "آپ سدرہ کو صبح فوری بھیج دیجئیے گا۔ ناشتہ ہمارے ساتھ کر لے گی"۔

"اچھا"۔ انھوں نے کہا۔

سدرہ خوشی سے کچھ اچھل پڑی اور کھڑی ہو گئی۔

"کیا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے خالہ امّی"۔ یشارا ابھی کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہاں بیٹی! کچھ ہے تو سہی۔ زیتون بی نے بام لگا کے دبا دیا ہے۔ اب چائے پی لوں گی کم ہو جائے گا"۔

"میں آپ کا سر دبا دوں۔ خالہ امّی!"

"نہیں بیٹی۔ تم جاؤ۔ سدرہ کے ساتھ اس سے باتیں کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ اللہ تمھیں سلامت رکھے۔ نیک نصیبہ کرے۔ اللہ تمھارے سر سونے کا تاج سجائے۔ تم نے اتنا تو پوچھ لیا۔ بس میرا درد جاتا رہا"۔

سدرہ اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئی۔ وہ سیلینگ فین آن کر کے اس کے پاس آبیٹھی۔ "سچ مچ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا"۔ سدرہ نے کہا۔ "تم میرے پاس بیٹھی ہو۔ اچھا ذرا میرے ہاتھ میں چٹکی تو لو"۔

یشارا نے ہنس کر اس کا گال چٹکی میں دبا لیا۔

"ہاں۔ بس۔ اب یقین آگیا۔ کہ میں خواب نہیں دیکھ رہی ہوں۔" سدرہ بھی ہنس پڑی۔ پھر اٹھتی ہوئی بولی۔ "اچھا میں ذرا تمہارے لئے کچھ لے آؤں۔ ہم لوگ تو کچھ دیر ہوئی چائے پی چکے ہیں۔ تمہارے لئے کیا لاؤں کافی یا چائے؟"

"میں بھی پی ہی کے چلی تھی۔ تم بیٹھو باتیں کریں۔" یشارا نے اسے بٹھا لیا۔ "کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بارش، پانی اور ٹھنڈی ہواؤں سے گزر کر آرہی ہو۔ کافی ضرور پیو۔" سدرہ نے کہا اور کمرے سے نکل کر چلی گئی۔ یشارا نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ سدرہ نے اپنا کمرہ بہت سلیقے سے سجا رکھا تھا۔ دیوار گیر بجلی الماریوں میں خوبصورت اور رنگین گرد پوش میں لپٹی کتابیں۔ نظر آرہی تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی چوکی بچھی تھی جس پر جانماز تہہ کی ہوئی رکھی تھی۔ سامنے الماری میں رحل پر کلام پاک رکھا دکھائی دے رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پاس اس کی مسہری بچھی تھی۔ جس پر خوبصورت پھولدار بیڈ کور پڑا تھا۔ اس کے پاس روشنی میں لکھنے کی میز تھی۔ پھر اس کی نظر دروازے پر لگی ہوئی تصویر پر پڑی۔ بڑے روپہلے فریم میں سدرہ کے بھائی کی تصویر تھی۔ جن سے ابھی وہ مل کے آرہی تھی۔ اس کی نگاہیں صاحب تصویر پر گڑ کر رہ گئیں۔ اور دیر تک اس پر سے نہ ہٹ سکیں۔ ا کیا شاندار اور باوقار چہرہ تھا۔ یشارا کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ آگئی سدرہ واپس آئی۔ اس کے ہاتھوں پر ٹرے تھی۔ کافی کے سامان کے ساتھ کریم رول، نمکین بسکٹ، سینڈوچ اور تلے ہوئے کاجو بھی تھے۔

"یہ کیا۔ اچھی خاصی ٹی پارٹی کر رہی ہو تم۔" یشارا نے اپنے گالوں پر

ہاتھ رکھ کر حیرت سے کہا۔ "ارے مجھے کھانا پینا نہیں ہے سدرہ! میں تو جلدی چلی جاؤں گی۔ پرسوں ہمارے ہاں چوتھی کے نام سے دعوت ہو گی۔ تم بھی آؤ گی۔ امّی نے کہا تھا کہ بس سدرہ کو مدعو کر کے جلدی سے چلی آنا۔ اب پلیز مجھے جانے دو۔ ادھر ہمارے ڈرائیور صاحب بور ہو رہے ہوں گے۔"

سدرہ ہنس دی۔ "کھا پی رہے ہوں گے آرام سے۔ کافی اور بسکٹ بھجوا دیئے انہیں بھی۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آرام سے کھاؤ پیو۔ امّی خود ہی سمجھ جائیں گی کہ جہاں دو سہیلیاں اکٹھا ہوتی ہیں وہاں جلدی کا کام شیطان کا۔"

ثِیّار انے اس کے اصرار پر نمکین کاجو کی پلیٹ سے چند دانے اٹھالئے۔

"کون کون چل رہا ہے کل اپنے ساتھ۔" سدرہ نے پوچھا۔ "امّی، ابّا چل رہے ہیں کیا۔؟"

"وہ کیا چلیں گے۔" ثِیّار انے کہا۔ "بڑی مشکل سے تو ہم ہی کو اجازت دی ہے۔ وہ بھی نئے داماد کی خاطر شکنی کے خیال سے۔ منّو نے تو بھائی جان سے خوشامد کی تھی کہ ہمارے ساتھ چلئے۔ مگر۔!"

"راضی نہیں ہوئے۔"

"سر ہلا کے انکار کر دیا۔ منہ سے تک کچھ نہ کہا۔"

"ان کی ٹریجیڈی کا حال زہرہ نے سنایا تھا۔" سدرہ نے بڑے افسوس سے سر ہلا کر کہا۔ "میرا دل دکھ کے رہ گیا۔ بے چارے۔ ان پر گہرا اثر ہونا لازمی بات ہے۔"

ثِیّار اکافی اداس ہوتی ہوئی بولی۔ "گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ

ہر غم کا اثر پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ مگر بھائی جان پر گزرتا ہوا ہر لمحہ غم کی ایک نئی دستک دیتا ہوا گزرتا ہے۔ اب تو جیسے بولنا ہی بھول چکے ہیں۔ ایسا افسوس ہوتا ہے انھیں دیکھ کر۔ ارے ایسا حساس ہونا بھی کیا۔ فضہ باجی اتنی ہی عمر لائی تھیں۔ اللہ کی مرضی میں کسے دخل ہے۔ امّی نے کئی بار ان سے کہا تھا۔ کہ میاں اب بھول جاؤ اس حادثے کو اور مجھے اجازت دو کہ میں تمھارے لئے دلہن لاؤں۔ تمھارا ایک ساتھی ہوگا۔ پھر ننھے منّے بچے ہوں گے۔ دنیا میں تمھارا دل لگ جاوے گا۔ نہیں مانے۔"

"کیوں نہیں مانے۔ امّی نے بڑی غلمتاری کی بات کہی تھی۔"

"کہنے لگے۔ اس دنیا میں مجھے دل لگا کے کیا کرنا ہے۔ جب کہ ایک دن مجھے بھی یہ چھوڑ کے جانا پڑے گا۔ آپ اس قسم کی کوشش مت کیجئے۔ میں ساری زندگی فضہ کو بھول نہیں سکتا۔"

"فضہ نام تھا ؟"

"ہاں۔ بے حد خوبصورت، بڑی خوش اخلاق، انتہا سے زیادہ خوش مزاج اور محبت کرنے والی تھیں۔ باجی کی بھی دوست تھیں !" بیسارا اس ذکر سے کچھ دلگیر سی ہو گئی۔ "سلیقہ مند اتنی کہ اگر گھنٹہ بھر کے لئے ہمارے ہاں آتیں تو سارا گھر سنوار دیتیں۔ اور ابا کے لئے قورمہ پکا کر رکھ جاتیں۔ ابا کو کچے ناریل کا قورمہ بہت پسند ہے۔ ارے سدرہ ایک بھائی جان ہی پر کیا منحصر ہے۔ جب ان کی چکنا چور لاش گھر پر لائی گئی ہے تو کوئی بھی ہوش میں نہ رہ سکا۔ امّی تو کتنے دنوں تک غم لئے پڑی رہیں۔ انھیں کوئی بھول نہ سکا تو بھائی جان کیسے بھول سکیں گے۔ جن کا ان سے دیر کا ساتھ تھا۔"

"اچھا یُسارا۔ یہ تو بتاؤ۔ کہ جب تم علیگڈھ چلی جاؤ گی تو پھر تمھارے ہاں کتنی تنہائی ہو جائے گی۔ اب الماس باجی تو سُسرال کی ہو چکیں" سدرہ بولی۔ کافی ہو چکی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھا کر تپائی پر رکھ دی "ابّا اور بازل بھائی باہر رہتے ہیں۔ منّو ایک نمبر کا شیطان ہے۔ اس کا قدم گھر میں ٹکتا ہی نہیں۔ تمھاری امّی کتنی اکیلی ہو جائیں گی"

"یہی میں بھی سوچتی ہوں" یُسارا نے پر تفکر لہجے میں کہا۔ "رات میں نے ابّا سے کہا تھا کہ اب مجھے آپ یہیں روک لیجئے۔ مگر ابّا نے کہا کہ بیٹی اپنی چچی کی محبت کی یوں ناقدری نہ کرو۔ تم جانتی ہو کہ وہ تمھارے بغیر دیوانی سی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا تمھارا جانا ضروری ہے۔ اب تمہی بتاؤ۔ ایک طرف ابّا ہیں۔ دوسری طرف چچی جان ہیں۔ میں بھلا کس کا حکم ٹال سکتی ہوں"

"تمھاری چچی جان نے تو یہاں آنے کو لکھا تھا"

"ان کے کھیتوں اور بڑے مکان کے دو تین مقدمے ہیں" یُسارا نے کہا۔ "وہ کیا آئیں گی۔ ابّا ہی مجھے وہاں پہنچا آئیں گے"

"تمھارا دل یہاں زیادہ لگتا ہے کہ وہاں۔؟"

"سدرہ مجھے دونوں جگہ اتنی محبت ملی ہے کہ میں ابھی تک اندازہ ہی نہیں لگا سکی۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں ہی جگہ میرا دل لگ جاتا ہے" یُسارا بولی۔ "ممکن ہے کہ باجی اور دولہا بھائی گھر آ گئے ہوں۔ اچھا اب مجھے اجازت دو سدرہ۔ کل ملیں گے"

دفعتہً دالان سے سدرہ کو مصطفٰے نے آواز دی۔ وہ جھپٹ کر باہر نکلی تو مصطفٰے نے کہا۔

"اپنی سہیلی سے کہو کہ ڈرائیور صاحب ان کا انتظار کر رہے ہیں"

"ہائے بھائی جان۔ ابھی تو ہم نے باتیں شروع ہی نہیں کیں۔" روہانسی ہو کر سدرہ نے کہا۔ "ان سے کہئے کہ ذرا دیر تو اور انتظار کریں۔"

مصطفٰے کی مسکراتی ہوئی نظریں دیوار گیر کلاک پر پڑیں۔

"گیارہ بجے وہ تشریف لائی تھیں۔ اور اب سوا بارہ ہو رہے ہیں۔ ابھی تک باتیں شروع ہی نہیں ہوئیں۔ تو پھر وہ ختم کب ہوں گی؟"

یشار دروازے میں دکھائی دی۔

"اب میں چلتی ہوں بہن۔" اس نے پیار سے سدرہ کے بال چھو کر کہا۔ "اب کل تو تم آ رہی ہو۔ جی بھر کے باتیں کریں گے۔ اب مجھے جانے دو بادل پھر گھنے ہونے لگے ہیں۔ بارش ہونے لگے گی تو پھر مصیبت آ جائے گی۔"

"اچھا!" منہ لٹکا کر سدرہ نے کہا۔

یشار جاتے ہوئے بیگم یاور سے مل کر گئی۔ اور یکبارگی مصطفٰے کی طرف مڑ کر بولی۔

"تو آپ کل سدرہ کو میرے ہاں پہنچا دیں گے۔؟"

"کیوں؟" مصطفٰے اس کے چہرے پر نظریں ڈالنے سے گریز کر رہے تھے۔ اسے دیکھ کر پھر بھولنا ناممکن تھا۔

"پکنک پر جائے گی ہمارے ساتھ۔ پہنچا دیجئے گا نا؟"

"پہنچا دوں گا۔"

وہ چلی گئی۔ اور اپنے حسن کی جگمگاہٹ چھوڑ گئی۔ سدرہ اسے نیچے تک پہنچا کر کچھ اداس سی اپنے کمرے میں جا بیٹھی تھی۔

مصطفٰے دیر سے بیٹھے بیگم یاور سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ بیگم یاور کے چہرے پر عجیب عجیب کیفیات رہ رہ کے نظر آ رہی تھیں۔ ان کی باتوں پر

کبھی مصطفےٰ سنجیدہ ہو جاتے کبھی مسکرانے لگتے۔ دفعتہً مصطفےٰ نے کچھ ہنس کر کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کا دل یک بیک ماموں جان محترم سے کھٹا کیوں ہو گیا۔ جبکہ آپ نے کہا ہے کہ بھیّا سے دل کھٹا ہو گیا۔ آپ تو انھیں بہت چاہتی تھیں۔ آپ کے میکے میں ایک وہی تو رہ گئے ہیں۔ کیا وجہ ہوئی ہے؟"

"بیٹے! میں پچھلی شام سدرہ کے ساتھ ان کے ہاں گئی تھی۔"

"امی۔ ایک عرض میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اگر ماموں جان کے ہاں کبھی پھر جائیے تو براہ کرم سدرہ کو اپنے ساتھ نہ لے جائیے۔ میں نہیں چاہتا کہ الطاف، اوصاف یا توصیف وغیرہ کی نظریں اس پر پڑیں۔ بڑا ناگوار احساس ہوتا ہے مجھے۔ آپ اکیلی جایا کیجئے یا پھر کوئی ملازمہ آپ کے ساتھ جایا کرے۔ سدرہ کا لڑکوں میں جانا میں مناسب نہیں سمجھتا۔"

"اے بیٹا۔ سنو تو۔ یہی تو میں تم سے بھی کہنے والی تھی۔ بیگم یادہ کو بات کرنے کا سرا مل گیا۔ میرا دل یوں ہی ان پر سے نہیں اترا۔ یہی تو بات ہے۔ کہ کل اتفاق سے ان کے پانچوں لڑکے گھر میں تھے۔ بھابی جان نے جیسے انھیں ہر آج کرنے کو سامنے لا بٹھایا تھا۔ کہنے لگیں۔ ان میں سے جسے چاہو اپنا داماد چن لو۔ سدرہ سامنے تھی بیچاری یوں جیسے زمین میں دھنس گئی۔"

"دیکھئے۔ واقعی کتنی قابل اعتراض بات ہے۔"

"کہنے لگیں۔ کہ جب سے ان کم بختوں کے کان میں بھنک پڑ گئی ہے کہ

یا ور میاں داماد کو اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے خرچ پر انگریزی ملک بھجوا دیں گے۔ بس کنجوس لالچی مارور کی رال ٹپک رہی ہے۔ آپس میں ابھی سے جھگڑنے لگے ہیں کہ کون یاور میاں کا داماد بنے گا۔ اے مصطفےٰ بیٹے ایسی رکیک بات سن کر میں تو غیرت سے گڑ گئی۔ ان کے منھ سے اتنی ہلکی بات نکلی کیسے۔ مجھے تو یہی غم ہے حالانکہ بھابی جان خود کھاتے پیتے گھرانے کی ہیں۔ مگر لالچ ان کے مزاج میں اتنا ہے۔ توبہ"

"آپ نے کیا کہا۔؟"

"پہلے میں نے سدرہ کو اپنے پاس سے اٹھا دیا کر ریاست کے پاس جا بیٹھے۔ پھر بھابی جان سے کہا۔ کہ لڑکی پر میرا اختیار صرف اتنا ہے کہ اس کی ماں ہوں۔ باقی سارے اختیار اس کے باپ اور بڑے بھائی کے ہیں۔ آپ یہ بات انہی سے کہئے گا۔ انہی سے جواب مانگئے گا۔"

"نہیں۔ کہنا چاہئے تھا امی۔ آپ کو اتنا بھی نہیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ تو ایک مبہم سا وعدہ آپ کر آئیں۔ اب وہ ہم سے جواب مانگنے ضرور تشریف لائیں گے۔ ان کے لڑکے پڑھے لکھے کہاں تک ہیں۔ اور کیا ابا نے کبھی ان کے سامنے یہ ذکر کیا تھا۔ کہ وہ اپنے داماد کو امریکہ یا لندن کہیں بھجوا دیں گے۔" مصطفےٰ کے چہرے پر برہمی کی شکنیں پڑ گئیں۔

"ذکر تو نہیں کیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ تارہ کو جس طرح لندن پلٹ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس شوہر ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں سدرہ کو بھی کوئی ایسا ہی ساتھی ملے۔ اگر نہ ملے گا تو میں اپنے خرچ پر اپنے پسندیدہ لڑکے کو امریکہ یا لندن یا کہیں اور وہ جانا پسند کرے گا بھجوا دوں گا۔ تاکہ سدرہ کو یہ احساس نہ ہو کہ بڑی بہن کو اعلیٰ تعلیم یافتہ شوہر۔۔

سول سرجن نصیب ہوا۔ اور اسے یہیں سے پڑھنے لکھنے کے پلے باندھ دیا۔ بس آتی سی بات بجانے کس ذکر پر نکلی تھی۔ جسے بھابی جان نے گرہ میں.. باندھ لی ہے۔"

"کیا ان کے صاحبزادوں میں واقعی کوئی ایسا ڈگری ہولڈر ہے۔ جو باہر جانے کے قابل ہو۔"؟ مصطفیٰ نے بڑے استکراہ سے پوچھا۔ وہ تو ہمیشہ ہی سے ماموں کے گھرانے سے بیزار تھے۔

"سب سے بڑے میاں الطاف ہی نے میٹرک سے آگے نہ پڑھا۔" بیگم باور بولیں۔ "دوسروں کا حال نہیں معلوم۔ میں کیوں پوچھ کے بات کو مضبوط کر دیتی۔ وہ یہی سمجھ بیٹھیں کہ سچ مچ ہمارا ارادہ ان کے بیٹے کو باہر بھیجنے کا ہے۔ اور اب سچ پوچھو تو۔ میں سدرہ کو اس گھر میں دینا نہیں چاہتی۔ ان کے لالچی انداز نے میرا مزاج خراب کر دیا۔ کل سے یہی سوچ سوچ کے سر میں درد کر لیا میں نے۔ کہ اگر وہ لوگ تم سے یا "ان" سے جواب لینے آ گئے تو۔ کیا ہو گا۔ تمہارے ابا کو تو کچھ خبر ہی نہیں۔ کتنا خفا ہوں گے۔ پہلے ہی کہتے رہتے ہیں کہ کلھیا میں گڑ پھوڑتی رہتی ہو۔ ان کی خفگی کے خیال سے بخار سا چڑھتا معلوم ہو رہا ہے۔"

"بیکار فکر کرتی ہیں آپ!" مصطفیٰ نے انھیں تسلی دی۔ "ابا سے کچھ مت کہئے۔ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ اچھا اور کیا باتیں ہوئیں؟" مصطفیٰ! بھی تو دوسری طرح اس قصے میں الجھے ہوئے تھے۔ صاحبزادی ریاست جہاں کا آسیب ان پر بھی سوار تھا۔ لہٰذا انھوں نے دوسری طرف سے گھما کر ناک پکڑی۔ بیگم باور کی کراہ نما گہری سانس نے غمازی کی کہ ان کے سلسلے میں بھی کچھ گھپلا ہوا تھا۔ وہ اپنا

سوال پوچھ کے جواب کے انتظار میں خاموش بیٹھے رہے۔ بیگم یاور نے کچھ کھانس کر گلا صاف کیا۔ آواز کی راہ ہموار کی اور خجالت کے انداز میں بولیں۔ "پہلے میرا خیال تھا کہ ریاست گھر کی لڑکی ہے۔ دیکھی بھالی خون ہڈی دیکھنے کا چکر نہیں ہے۔ ماں باپ کی ایک ہے۔ چلو۔ اسے اپنے ہی گھر بیاہ لاؤں۔ مگر اب یہ خیال بھی دل سے نکالنا پڑا۔ کیونکہ پہلے تو ایسا ہوتا تھا کہ مجھے دیکھ کر کہیں ادھر ادھر ہو جاتی تھی۔ سلام تک کرنے نہ آتی تھی۔ مگر کل تو اس نے سلام کیا کیا جیسے لٹھ مار دیا۔ پھر۔ وہ جو موا بے حیائی کا فیشن نکلا ہے کہ مفلر کی پٹی کی طرح ڈوپٹہ صرف ایک ہی کندھے پر ڈالے رکھتے ہیں۔ آدھا بدن نگوڑا ننگا دکھائی دیتا رہے کچھ پروا نہیں۔ بس وہ مخلوسا ڈوپٹہ کندھے پر ڈالے فریج سے آئسکریم یا جانے کھیر کٹورے میں نکالے سامنے کھڑی بھکر بھکر نگلا کی اور پھر الٹے ہاتھ سے منہ پونچھ کے کمرے میں گھس گئی یہ ہیں تو میاں حق دق اسے دیکھا ہی کی۔ کہاں اٹھا کے دھر دی تھی نگوڑی ناٹھی نے شرم حیا تہذیب میرا تو دل بیٹھ گیا۔"

"آپ کے دل بیٹھنے کی باتیں عجیب ہیں امی۔" مصطفیٰ نے جواب دیا "ارے وہ کچھ بھی کرتی رہیں۔ اب دیکھنے کو یہ آپ کا درد سر ممکن ہے۔ کہ بلڈ پریشر کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہو۔ میں جا کے ڈاکٹر جوشی صاحب کو فون کر آتا ہوں۔ آ کے آپ کو دیکھ لیں۔ انہی کی دوا پر آپ کو اعتقاد بھی ہے۔"

"بیٹے تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں کہ اس گھر میں وہ بہو بن کے اگر آ گئی۔ تو انہی حرکتوں سے مجھے بن موت مار ڈالے گی۔ میں تو

بنائی برابر بدسلیقہ پن، بیہودگی برداشت نہیں کر سکتی۔ ادھر بھابی جان فرمائش کر رہی تھیں کہ۔ آپ نے ہم سے تاریخ نہیں مانگی۔ رجب کا مبارک مہینہ نزدیک آرہا ہے اسی مہینے میں شادیوں سے فراغت ہو لے۔ ریاست کو میں لے آؤں اپنے کسی لڑکے سے سدرہ کو وہ بیاہ لے جائیں"

"امی۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ لیکن مجھ سے اور آپا سے مشورہ لئے بغیر اپنی مرضی سے جو رشتے آپ نے طے کئے ہیں۔ وہ معاف کیجئے گا۔ کچھ مناسب نہیں ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں آپ سے کئی بار کہا تھا کہ جب تک میرا۔۔ عہدہ اسی شہر میں منتقل نہیں ہو جائے گا۔ میں شادی بیاہ کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔ سنا ہے کہ میری فرم مجھے تین سال کے لئے اٹلی بھجوانے والی ہے۔ اگر میں چلا گیا تو پھر۔ وہ۔ محترمہ ریاست جہاں۔ یا کوئی اور بھلا آپ کے پاس رہنا گوارا کریں گی۔ میں تو نہیں سمجھتا دوسری بات یہ۔ کہ سدرہ کے لئے میں ماموں صاحب قبلہ کے کسی بھی صاحبزادے کو پسند نہیں کرتا۔ چاہے وہ الطاف ہوں یا ان کے کوئی بھائی اور"

"میاں تم تو اور بھی میرا خون سکھائے دے رہے ہو" بیگم یاور کا چہرہ ستا گیا۔ "اسی فکر میں تو میں نے سر میں درد پیدا کر لیا ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔

"کس بات کی فکر ہے" مصطفےٰ نے پوچھا۔ "آپا سے حجاب دیہی کی"

"وہ بھی اور۔ یہ بھی کہ اب میری طبیعت بھی ادھر نہیں آتی" بیگم یاور بولیں۔ "ایک تو ریاست کی بے حجابی کی وجہ سے۔ اور دوسری بات بھابی جان کی اوچھی حرکتیں۔ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے ریاست کے جہیز کی فہرست سنائی۔ اور خاص کر کے ذکر کیا تھا کہ ریاست کا پلنگ

ہی دس گیارہ ہزار کا ہے۔ کیا مجھے بھی ان عورتوں کی طرح لالچی حریص سمجھا تھا۔ جو اپنے بیٹوں کو بیچتی ہیں۔ جنجبس جہیز کے آخور کی طلب ہوتی ہے۔"

"یہ تباہیئے کہ ایسے خیالات آپ کے پہلے تو نہ تھے۔ آپ تو اپنے بھائی صاحب اور ان کے کنبے کی اس قدر معتقد تھیں۔" مصطفیٰ نے پوچھا۔!

"کیا صرف اس لئے ان سے برگشتہ ہو گئیں کہ انھوں نے ایک تو اپنے لڑکوں کو نیلام پر چڑھا دیا۔ دوسرے اپنی صاحبزادی کا جہیز آپ کو دکھایا یا پھر کوئی اور وجہ ہے۔ آپ کے خیالات میں ایسا انقلاب کیوں آ گیا۔"

"اب کیا بتاؤں بیٹا۔" انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "یہ میری جلد بازی اور شامت ہے۔ دو طرف سے شکنجے میں جکڑی ہوں۔ ایک تو تمھارے ابّا سے جواب سوال کا ڈر ہے۔ دوسرے بھیّا سے انکاری جواب دینے کا دھڑکا لگا ہے۔ اور ــــــ!"

"اور تیسری کوئی وجہ۔" مصطفیٰ نے پوچھا۔

"وہ بھی ہے۔" اب کی ان کی آہ زیادہ گہری، اور نہ زیادہ یخ بستہ تھی۔ "مگر وہ ابھی میں منھ سے نہیں نکالوں گی۔ کیا پتہ۔ میری یہ تمنّا بھی پوری ہو کہ نہ ہو۔۔؟"

"تمنّاؤں میں خود کو بھی نہ الجھائیے امّی۔ بس وقت پر جو بھی سوجھ جائے گی۔"

"ایک بج چکا ہے۔ بلکہ ظہر کی اذان ہو چکی ہے۔" دفعتاً یاور صاحب دالان کا دروازہ کھول کر اندر آئے۔ اپنے ہاتھ میں دبی کتاب انھوں نے ٹی وی پر رکھ دی۔ اور پاس آ کر دونوں پر گہری نظر ڈالی۔ "کیا بات

ہے؟۔ دوپہر کے کھانے کے لئے مجھے نہیں بلایا۔"

"جی! کوئی خاص بات نہیں ہے ابّا۔" مصطفےٰ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"امّی کے سر میں کچھ درد ہو رہا تھا۔ اس لئے میں ——— آ!"

"بھائی ہزار دفعہ سمجھا چکا ہوں کہ بہت معمولی اور غیر اہم معاملات پر دماغ کا خون جلا کر اپنا بلڈ پریشر بڑھایا نہ کرو۔" یاور صاحب کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "لیکن ان کی عادت ہی ایسی ہے۔ کہ میں تو عاجز آچکا ہوں۔ اگر ملازمہ بھی گھنٹہ بھر دیر کر کے آئے گی۔ تو اسی بارے میں دن بھر سوچتی رہیں گی۔ اب کس بات کا درد ہے۔؟"

"آپ نے تو مجھے شروع ہی سے پاگل سمجھ رکھا ہے۔" بیگم جھلا گئیں۔ "آپ کی ایسی دل جلی باتوں سے اور میرا سر گھوم جاتا ہے۔ جائیے۔ نہیں ہے میرے سر میں درد وغیرہ۔"

مصطفےٰ مسکرانے لگے۔ "بات کچھ خاص ہی ہے۔ مگر چلئے پہلے کھانا کھا لیں۔ پھر میں آپ کو بتا دوں گا۔ کہدوں لڑکی سے کہ کھانا لگا دے۔"

"کہدو۔ مگر یہ سدرہ کہاں رہ گئی۔ تم کیوں کہو گے۔ اس سے کہو۔ وہ لے آئے۔" یاور صاحب نے کہا۔

"سدرہ کو اس کی ایک سہیلی نے کل پکنک پر چلنے کی دعوت دی ہے۔ کچھ کپڑے وغیرہ ٹھیک کر رہی ہو گی۔" بیگم نے کہا۔ مصطفےٰ کمرے سے نکل کر چلے گئے۔ یاور صاحب کرسی سے اٹھ کر بیوی کے بالکل قریب پلنگ پر جا بیٹھے۔

"ارے ادھر ہی بیٹھئے۔ ابھی سدرہ آتی ہو گی۔ آپ کو تو سچ مچ اس عمر میں بھی ——— آرہی ہے شاید وہ ادھر ہی۔" بڑھاپے کے جذبے

بھی چہرے گلابی کر دیتے تھیں۔
یاور صاحب ہنس کر پھر کرسی پر جا بیٹھے۔ اور بولے۔ "سچ بتاؤ کیا بات ہے۔ تمہارے چہرے پر پریشانی اور فکریں گویا منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔"
"کیا بتاؤں" انھوں نے جان بوجھ کر آواز گلوگیر اور لہجہ رحم طلب بنا لیا۔ کہ خواہ مخواہ کسی کو بھی ترس آجائے۔ "سب سے بڑی فکر تو یہی ہے کہ میری بات سن کر آپ کیا کہیں گے؟"
"میں کیا کہوں گا" یاور صاحب نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔
"ارے میں تو تمہارا انکا جی غلام ہوں۔ میری مجال بھلا کیا کہ کچھ کہہ بھی سکوں۔ تمہارے حضور میری زبان کھلے گی بھی۔ کہہ دو شاباش۔ میں تمہاری پریشانی برداشت نہیں کر سکتا۔"
رکتے ہوئے وہ بولیں۔ "آپ نے کل مجھ سے پوچھا تھا کہ کہاں جا رہی ہو۔ میں نے جواب دیا تھا کہ ایک ضروری جگہ۔ اب میں چھپا رہی ہوں۔"
انھوں نے کہا۔ اور پھر جان پر کھیل کر اپنی فکروں کی ساری وجہ تفصیل سے سنا دی۔ پھر اس ستم نصیب مجرم کی طرح جسے سنگین جرم کی کڑی سزا کی توقع ہو۔ چہرہ افسوس زدہ بنا کر رہ گئیں۔ ان کے خوف کے برعکس یاور صاحب نے سارا قصہ سن کر بے پروائی سے ہاتھ ہلا دیا۔ اور بولے۔
"کیسی احمقانہ باتوں پر خون جلانے اور بلڈ پریشر بڑھانے کا سامان کر بیٹھتی ہو۔ ارے یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ ہے جس پر اتنی سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ سنو! اپنے بھائی صاحب محترم سے کہہ دو کہ مصطفےٰ کی بات چیت تم نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ وہ خاندان میں رشتہ کرنے کے خلاف ہیں۔ لہٰذا اماں خیر شما بسلامت۔ دوسرا دروازہ دیکھیں اور میں اپنی لڑکی

ان سے یہاں ہر گز نہ بیاہوں گا۔ چاہے اسے مزید دس سال رشتہ نہ ملے۔ ہمیں ایسا لالچی اور حریص داماد نہیں چاہئیے۔ جو لڑکی والوں کے در پر جہیز کی طلب کا کشکول پسارے کھڑا ہو جائے۔ اچھا۔ ہاں۔ سچ کہو۔ انھوں نے اپنے سارے صاحبزادوں کو تمھارے سامنے لا بٹھایا تھا۔ کہ جن میں سے ایک داماد پسند کر لو۔"

"مجھے خود بھی اتنا تعجب ہوا تھا۔" شرمندہ ہو کر بیگم نے کہا۔

"اور لڑکی کا جہیز بھی تمھارے للچانے کے لئے دکھا دیا تھا۔"

"ہاں!"

لاحول ولا قوۃ۔" یاور صاحب نے کہا۔ یہ ساری خرافات محض اس لئے ہوئی ہے کہ تم نے نہ تو مجھ سے کچھ کہا۔ نہ مصطفےٰ کو کسی بات کی ہوا لگنے دی۔ اب فوراً یہ سلسلے ختم کر دو۔ سکھ کی سانس لو۔"

"کیا کہیں گے بھیا۔ یہی سوچ کر ڈری جا رہی ہوں۔"

"کیا مطلب۔ ڈر کاہے کا۔" یاور صاحب بھڑک اٹھے۔ سولی چڑھا دیں گے وہ ہمیں۔ پھانسی پر لٹکا دیں گے۔ صرف یہ کریں گے کہ تعلقات منقطع کر لیں گے۔ کر لیں۔ ہمیں نہ ان کی دوستی سے کچھ فائدہ ہے۔ نہ دشمنی سے کچھ نقصان پہونچے گا۔ سمجھیں۔ انھیں زیادہ دنوں تک کسی خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ صرف تمہی پر بھروسہ کئے بیٹھی رہیں گی۔ اب تم صاف جواب دے دو گی تو دوسرے پیغام منگوا لیں گی۔

"وجہ پوچھیں گے وہ لوگ۔"

"بس ہماری مرضی۔ اب ہم نہیں چاہتے کہ یہ ادلے بدلے کی شادیاں

ہوں۔ میں ایسی تبادلے کی شادی کو منحوس سمجھتا ہوں۔"

"ہیں بھابی جان کی زبان سے بہت نالاں ہوں۔ آپ ہی کیوں نہ کہہ دیجیے۔"

"ضرور کہہ دوں گا۔" بادرہ صاحب بولے۔ "مجھے تعلقات کے ختم ہونے کے خوف سے اپنی اولاد کو تعلقات پر بھینٹ چڑھانا نہیں ہے۔ معاف کرنا تمھارے بھانجے جیسے کچھ ہیں۔ وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر بھانجی صاحبہ بھی نور اً اعلیٰ نور ہیں۔ مجھے یاد ہے ہفتہ بھر کے لئے ہمارے یہاں انھوں نے قیام فرمایا تھا۔ ہمیشہ گیارہ بجے دن کو سو کے اٹھتی تھیں۔ مانا کہ وہ ماں باپ کی اکلوتی ناز پروردہ ہیں۔ مگر اپنی بھی تو کوئی عقل ہے۔ اپنا بھی تو ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ بیس بائیس برس کی لڑکی کا یہ وطیرہ کیوں کر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ آدھا دن سو کر گزارے خدانخواستہ اگر وہ لڑکی تمھاری بہو بن کر آ گئی تو یہ سمجھ لو کہ لیمو کا وہ قطرہ ثابت ہو گی جو مٹکے بھر دودھ کو پانی کر کے رکھ دے۔ خاندان کا شیرازہ ہی بکھر جائے گا۔ اور تم کچھ کہہ بھی نہ سکو گی۔ کہ تمھارے ہاتھ بندھے ہوں گے۔ کیوں کہ تمھاری لڑکی وہاں ان کی بہو ہو گی۔ ویسا ہی ستم وہ اس بے زبان پر ڈھائیں گے۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"اچھا ایک بات مجھے بھی بتاؤ۔" بادرہ صاحب نے کہا۔ "ابھی کل تک تم اپنے میکے والوں کے گن گاتے نہ تھکتی تھیں۔ اب کیا ہوا ہے۔ تمھارے خیالات کیوں اتنے بدل گئے ہیں۔ ایک سرے سے تم ان سے برگشتہ ہو گئی ہو۔ کیا وہاں کسی نے تمھاری توہین کی ہے؟"

"ہے ایک وجہ۔" بیگم یاور کے لبوں پر اب طمانیت انگیز مسکراہٹ نظر آئی۔ "آپ سے کہوں گی تو آپ پھر کہیں گے کہ بادل دیکھ کے گھڑے پھوڑ دینے۔"

"نہیں کہوں گا۔" انھیں ہنسی آگئی۔

"آپ نے احمد بھائی کی چھوٹی بچی کو دیکھا ہے۔ کیسی پیاری گڑیا ایسی ہے۔"

"ہاں تو پھر؟"

"میں اسے اپنے گھر لاؤں گی۔ ایسی پیاری حسین بچی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ جیسے وہ میرے مصطفےٰ ہی کے لئے بنی ہے۔ احمد بھائی سے کہوں گی وہ انکار نہیں کریں گے۔" بیگم نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی اس کا پیغام سلام کہیں نہیں ہوا ہے۔ میں جلدی ان کے کانوں میں بات ڈال دوں۔ ایسا نہ ہو کہیں کہ اس کا پیغام کہیں اور سے آجائے۔ سدرہ کو بھی وہ بہت پسند آئی وہ تو چاہتی ہے کہ کسی طرح اسے اپنے ہاں لے آئے۔ اس بچی کے مقابلے میں بھیا کی لڑکی تو مجھے فقط گوشت کا ڈھیر دکھائی دیتی ہے۔ اب اس سے میرا دل اتر گیا ہے۔"

"احمد صاحب کی بچی ہے تو واقعی بہت خوبصورت۔" یاور صاحب نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ اپنے گھر میں آئے۔ تم نے ابھی تک ان کی بیوی سے کہا نہیں؟"

"میں تو پچھلے رشتے ناتوں کے ادھیڑ بن میں پڑی تھی۔ کہتی کیسے؟"

"اچھا اب کسی بہانے ان سے ملنے جانا تو کہہ دینا۔" یاور صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ "بھئی اب کھانا منگوا دو۔ صبح میں نے صرف کافی پی تھی۔ اب بہت بھوک لگی ہے۔"

زہرہ نے ہُشیارا کے بڑے بھائی بازلؔ کی جو المیہ کہانی سدرہ سے کہی تھی وہ اسے بھول نہ سکی۔ بڑی حساس اور جذباتی تھی۔ پہروں ایک بات کو سوچ جاتی۔ اس نے اکثر بازلؔ کو دیکھا تھا۔ ہُشیارا کے گھر آتے جاتے اس کا سامنا بھی ہوا تھا۔ اور اس نے کبھی کوئی جذباتی تاثر قبول نہ کیا تھا۔ انھیں کم آمیز کم سخن اور تنہائی پسند آدمی سمجھتی تھی۔ بہت پڑھے لکھے تھے۔ ہر وقت کتابوں میں گھرے رہتے۔ ہر وقت ہر جگہ ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی پڑھے لکھے لوگ علم دوست ہوتے ہی ہیں۔ کتابیں ہی ان کی ساتھی ہوتی ہیں۔ تنہائی ان کی رفیق اور محفل بلائے جان ثابت ہوتی ہے۔ بازلؔ کو بھی ایسا ہی سنجیدہ اور خشک انسان سمجھ کر سدرہ نے ان کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مگر اسے علم نہ تھا کہ ان کی ذات سے ایک ٹریجیڈی وابستہ تھی۔ اب وہ انھیں ایک مظلوم، دلگیر اور الم پسند انسان سمجھ کر ان کی طرف سے بہت کچھ سوچ چکی تھی۔

سدرہ کی فطرت ہی کچھ ایسی تھی۔ وہ کسی کا حقیقت سا دکھ بھی برداشت نہ کر سکتی۔ دوسروں کے غموں کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنی طبیعت خراب کر لیتی۔ اب وہ ہُشیارا سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس کے غمدیدہ بھائی سے کیوں نہ متاثر ہو جاتی۔ دو تین راتیں اس نے اسی اضطراب میں بسر کر دیں۔ کہ وہ ان کا دکھ کس طرح بٹا سکتی تھی۔

پھر ہُشیارا نے اسے پکنک پر مدعو کیا۔ اور اس کے دل کی مراد بر آئی۔

صبح ہی سے اٹھ کر اس نے بناؤ سنگھار کیا۔ اور مصطفےٰ کے ساتھ احمد صاحب کے گھر پہونچ گئی۔

کمپاؤنڈ میں دو تین کاریں کھڑی تھیں۔ اور کتنی ایک لڑکے لڑکیاں برآمدے میں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ کتنی ایک باسکٹیں اور ٹفن باکس بھی کاروں کے پاس رکھے تھے۔

انھیں دیکھ کر لڑکے منڈیر پر سے اتر گئے۔

"ارے مصطفےٰ بھائی آپ" منیر دوڑ کر ان کے بازو سے چمٹ گیا۔

"قسم ایمان کی۔ آپ کے ساتھ چلیں گے تو کیا مزہ آئے گا۔ یہاں تو بھائی جان کی خوشامد کرتے کرتے زبان کی نوک گھس گئی۔ مگر ان کی ایک 'نہیں' کیا مجال کہ 'ہاں' سے بدل جائے۔ بزرگوں کا کہا ماننا تو انھوں نے سیکھا ہی نہیں۔ آپ خدا کے لئے سعادتمندی کا ثبوت دیجئے۔ اور میرا کہا مانئے۔"

"صاحبزادے۔ آپ کے سنے بزرگوں کا حکم ماننا میں نے کبھی نہیں سیکھا۔" مصطفےٰ نے مسکرا کر اس کی پیٹھ ٹھونکی "میں تو تمھاری دوست کو پہونچانے آیا تھا۔ اب جارہا ہوں۔ بیکار خوشامد میری بھی نہ کرو۔ اب جانے دو!"

وہ برا سا منھ بنا کر الگ کھڑا ہو گیا۔ "اس طرح آپ حضرات اپنا نقصان کریں گے۔ ہم بیس حضرات ہیں۔ اور ہم نے چالیس پیکٹ فرائی ٹفن میں بھروا لئے ہیں۔ کوکو کی پڈنگ ہے۔ سوکھے گیلے میووں کا حساب نہیں۔ ایک ڈبہ بھرا ہوا آئسکریم اور دہی بڑے۔ اور اللہ آپ کو نیکی دے کر نہ دے۔ آدھ سیر چٹپٹے کابچو۔"

"رشوت تو بے حد مزیدار ہے منو میاں مگر آپ لوگوں میں ہمارا کیا

کام ہے۔" مصطفیٰ نے ہنس کر جواب دیا۔" تم سدرہ کو اندر بھیج دو اور بتا دو
کہ بازل صاحب کمرے میں ہیں کہ چلے گئے۔ میں انسے ملنا چاہتا ہوں۔"
"سدرہ بی بی کی طرف تو میں دیکھوں گا بھی نہیں۔" برا سا منھ بنا کر منیر
بولا۔" ایک مرتبہ میں نے مسکرا کر ان کی دیکھ لیا تھا۔ بس وہ بگڑ گئیں۔ وہ
بگڑیں کہ اللہ دے بندہ لے۔ ہو گیا۔ کہنے لگیں کہ اس طرح لڑکیوں کو دیکھ
کر مسکرانے والے لوفر لفنگے ہوتے ہیں۔ انھیں گھر کا راستہ معلوم ہو تو
خود تشریف لے جائیں۔ اور ہاں۔ آپ کے بازل صاحب درویش صفت
ولی کامل اپنے حجرے میں ہوں گے۔ مراقبے میں آپ کو ان کے پاس بھی
نہیں لے جا سکتا۔ صبح ہی کو آرڈر مل چکا ہے۔ کہ جو بھی گھر پر آئے
کہہ دیں نہیں ہیں۔"
"کہہ دوں گی ان سے کر۔ آپ کے پیٹھ پیچھے منو آپ کو درویش اور
کیا کچھ کہتا ہے۔" سدرہ بولی۔
"ضرور کہہ دیجئے۔" منو بولا۔" شاید اسی طرح کان پر وہ جوں رینگے
جو سر میں ہے ہی نہیں۔"
"ارے دھوپ بڑھ رہی ہے۔" ایک لڑکا بولا۔" سدرہ اندر جاؤ
نہ بہن۔ سب کو لے آؤ سمیٹ کے۔ آخر کب پہنچیں گے۔ دو گھنٹہ
کا تو راستہ ہی ہے۔"
مصطفیٰ نے باہر کے ڈرائینگ روم کی طرف قدم بڑھائے۔ سدرہ
اندر چلی گئی۔ صحن میں قدم رکھا تھا کہ بازل سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان پر
ہمیشہ کی طرح سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ سفید لباس میں وہ زیادہ معصوم
لگ رہے تھے۔ سدرہ کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئے۔ مگر سدرہ کا ہاتھ

سپاٹ تھا پیشانی سے بہنا لگا۔ اس نے بے اختیار سلام کیا تھا۔ اور پھر جھینپ گئی تھی۔

بے حد سنجیدگی سے بازل نے جواب دیا۔ "وعلیکم السلام!" اور وہیں کھڑے ہو گئے تھے۔ سدرہ کو ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ان سے اس کی صدیوں کی شناسائی ہو۔ اس نے انھیں اپنا کچھ مان لیا تھا۔ اور خواہ مخواہ سمجھنے لگی تھی۔ کہ ان کے لئے وہ بھی اجنبی نہیں۔

وہ احمقانہ انداز میں مسکرائی۔ "آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔"

بازل نے اب بھی گہری سنجیدگی سے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہیں آتا۔ کہاں دیکھا ہے۔"

سدرہ کے حوصلے بڑھ گئے "میں پیارا کی دوست ہوں۔ امی کے ساتھ آپ کے ہاں آتی رہتی ہوں۔ آپ نے کبھی دیکھا ہوگا۔"

بازل نے جھینپے سے کھانس کر کہا۔ "پیارا اپنے کمرے میں ہوگی اور شاید آپ کی منتظر بھی۔"

سدرہ نے خفیف ہو کر کہا۔ "باہر بھائی جان بھی ہیں۔ آپ کے منتظر ہوں گے۔"

"اچھا۔ تو میں چلتا ہوں۔" انھوں نے ایک بار اپنی نگاہیں خلا سے ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پوچھا۔ "آپ کا مطلب شیراز صاحب سے ہے۔"

"جی نہیں۔" سدرہ ہنس دی۔ "میں کسی شیراز صاحب کو نہیں جانتی۔ میرے بھائی جان تو مصطفےٰ احمد صاحب ہیں۔"

"اوہو! آپ مصطفےٰ کی بہن ہیں۔"؟

"جی!"

"ارے سدرہ تم" دفعتاً تیمار اوہاں آئی۔ اور ان کی بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کتنی دیر لگادی۔ ہمیں تو تمھارا ہی انتظار تھا۔ کب آئیں؟"۔

لڑکیوں کو آپس میں الجھا چھوڑ کر باذل نے باہر کی راہ لی۔

"سنئے" پیچھے سے سدرہ نے ہانک لگائی۔

وہ مڑکر اسے دیکھنے لگے۔

"آپ ہمارے ساتھ نہیں چل رہے ہیں؟"

"جی نہیں" باذل نے جواب دیا۔ اور سدرہ کے لہجے میں اشتیاق کی تپش محسوس کئے بغیر مڑکر چلے گئے۔

"یہ سب لوگ ایسے ہی ہیں" تیمار انے برا سا منھ بنا کر کہا۔ "رات کتنی خوشامد کی تھی۔ امّی نے بھی کہا تھا کہ ساتھ چلے چلیں۔ انھوں نے امّی کی بھی بات نہ مانی کہنے لگے۔ مجھے مجبور کر کے دنیا کی طرف مت گھسیٹئے۔ کوئی جواب ہوا۔ میں کہتی ہوں کہ آخر ماضی کا ماتم کب تک۔ کیا اسی طرح درویشی کی زندگی گزاریں گے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ پچھلے سال ہی تو انٹھائیسویں سالگرہ تھی۔"

"بڑی دھوم سے منائی گئی ہوگی"؟

"خاک! وہ تو اس دن قبرستان میں فضہ باجی کی قبر کے سامنے بیٹھے رہے تھے۔"

"اتنی محبت تھی ان سے۔؟"

"بس اندازہ لگالو اسی بات سے۔"

"لیکن یہ وطیرہ تو اچھا نہیں نا۔ غم کو سینے سے لگائے جینا بھی کیا جینا۔ ایک روگ سا لگ جائے گا۔ انھیں اپنے ماں باپ کا خیال بھی نہیں ہے۔" سدرہ کے جذبوں کے ہمالیہ بلند ہوتے رہے۔

"اگر ہوتا، تو کچھ تو کہنا مانتے۔"

دفعتاً منّو نے پردہ سرکایا اور بڑی بھیانک سی چیخ ماری۔ دونوں جو باتوں میں گم ہو گئی تھیں۔ اچھل کر ایک دوسرے پر گریں۔ منّو نے قہقہہ لگایا۔

"ارے دن دہاڑے اس طرح ڈر دگی تو رات کو کیا عالم ہو گا! اگر کوئی بھوت ووت دکھائی دے جائے گا۔"

"خدا سمجھے اس کمینے سے۔" سدرہ اسے مارنے جھپٹی۔

"اسی طرح جان لے لے گا ایک دن۔" نیارا نے دل تھام لیا۔

"اگر ساتھ چلنا نہیں ہے تو ویسے کہو۔" منّو گرجا۔ "ادھر دولہا دلہن سمیت اپنے جیلی بھاپڑوں کے ساتھ آ گئے ہیں۔ ارے ایمان سے ایک صاحبزادی تو ان میں اتنی حسین ہیں کہ میری تو نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ تم دونوں کچھ نہیں ہو ان کے سامنے۔ دولہا کی بہن ہیں شاید۔"

"باجی آ گئیں۔" سدرہ خوش ہو کر بولی۔

"اتنی بے تکلفی سے باجی کے سسرال والوں کو برا بھلا کہہ رہے ہو۔ اگر کسی نے سن لیا تو۔" نیارا نے کہا۔ "یہی نا، کہ اچھے دل بہر رہے ہوں۔"

"دیکھیں چل کے ان حسین سی صاحبزادی کو۔" سدرہ نے کہا۔

"ہاں۔ جب وہ اس گدھے کو اتنی لگی ہیں۔ تو ابھی اس کا پیام دے دیں۔" نیارا ہنسی۔

"قسم سے ابھی تک دل دھک دھک کر رہا ہے"۔ سدرہ بولی۔

منو ہنس کر باہر چلا گیا۔ سدرہ اور ثریا ابھی باہر نکلیں۔ اور دونوں لپک کر المارس کے لپٹ گئیں۔ گلابی زرکار لباس اور گہنوں میں وہ بہت پرکشش ہو رہی تھی۔ ایک طرف کرسی پر ان کے شوہر نئے نویلے دولہا بھی بیٹھے تھے۔ غالباً ان کی پیشوائی کے لئے باہر سے رسماً بازل اور مصطفیٰ بھی آگئے تھے۔ مگر دونوں خاموش تھے۔ باتیں دولہا میاں کر رہے تھے بازل اور مصطفیٰ کی سنجیدگی کو دیکھ کر سدرہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ سنجیدگی اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ مگر وہ دونوں تو مثالی سنجیدہ تھے۔ ہمیشہ لبوں پر تالے ڈالے رکھنا بھی کیا۔ ملازم لڑکیاں ناشتے کا سامان تیزی سے میزوں پر لگا رہی تھیں۔

"آپ نے بڑی دیر لگا دی۔ صبح سویرے نکل چلتے تو بڑی تفریح ہوتی اب تو خاصا دن نکل آیا۔" ثریا نے کہا۔ "راستہ بھی اتنا طویل ہے۔ آتے جاتے ہی کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ وہاں گھومیں پھریں گے آخر کب؟"

"ابھی کافی وقت ہے۔" افتخار احمد نے کہا۔

"بیٹے جلدی جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ۔" بیگم احمد بولیں۔

سب اٹھ گئے۔ سدرہ چپکے سے منو سے بولی۔ "کہاں ہے تمہاری پسندیدہ لڑکی۔ اتنے گن گا رہے تھے۔"

"تاب نہ لا سکیں گی آپ۔ دل مضبوط کرنا پڑے گا۔" منو بولا۔

"مجھے تو کہیں دکھائی نہیں دیتی۔" ثریا نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ سامنے الماری کے پاس۔" منو نے سنجیدگی سے کہا۔

سدرہ اور پیارا کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ شاید الماس کی سسرال کی کوئی خادمہ تھی۔ بے چاری جی بھر کے سیاہ فام تھی۔ اور جتنی کالی تھی اتنی ہی فربہ اندام تھی۔ بچو کو رہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی پرزہ بھی اس کا ڈھیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے دو پیالی چائے ایک لمبے سے گلاس میں انڈیل لی تھی۔ اور کئی دن کے بھوکوں کی طرح بسکٹ منہ میں بھر رہی تھی۔ جلدی جلدی انھیں چباتی اور گلاس منہ میں لگا لیتی۔

"بڑے برے ہو تم" پیارا بولی۔ "اللہ کی بنائی ہوئی صورت پر ہنسنا اچھی بات نہیں۔"

"پسند ہے نا اسے" کہہ دو چچی جان سے۔ اتیار بھائی کو منو کا پیغام دے دیں۔ اسے بڑی اچھی لگ رہی ہے۔" سدرہ بولی۔

"میں نے کسی کی برائی تھوڑی کی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ چڑیا کی سی خوراک ہی نے یہ دن دکھایا ہے۔" منو بولا۔ "اب بھائی پسند ہے اپنی اپنی۔ اگر تم لوگ انھیں بھابی جان کہہ کر پکارنے کا وعدہ کرو تو میں خود اتیار بھائی سے ہاتھ جوڑ کے استدعا کروں کہ مصطفے بھائی یا بھائی میں سے کسی ایک کا پیغام دے دیں۔ وہ دونوں گو تم بدھ اسی صورت سے قابو میں آسکتے ہیں۔"

"منو!" بیگم احمد نے للکارا۔ "باتوں میں لگائے ہوئے ہے انھیں۔ تو نے تو کھا پی کے چھٹی کی۔ ذرا بھیج ادھر بچیوں کو۔"

"میں نے ناشتہ کر لیا امی۔" پیارا بولی۔

"جی۔ میں بھی کھا پی کے آئی ہوں۔ چچی جان۔" سدرہ نے کہا۔

"جلدی کیجئے جناب!" ایک لڑکے نے دروازے سے جھانک کر کہا۔
انتیار احمد اٹھ کھڑے ہوگئے۔ جلدی سے سنک میں ہاتھ دھوئے
اور رومال سے پونچھتے ہوئے بازل اور مصطفےٰ کی طرف بڑھے۔ وہ
بڑے خوش مزاج اور ہنس مکھ تھے۔ مسکرا کر دونوں سے کہا۔ "اب چلیں"۔
"جانا تو صرف آپ کو ہے انتیار صاحب"۔ بازل نے کہا۔ "مجھے کچھ لکھنا
ہے۔ اس لئے میں معافی چاہتا ہوں"۔
"لکھنا لکھانا تو آپ کا روٹین ہے۔ آج کوئی نئی بات نہیں۔ کچھ وقت
گھومنے پھرنے کا بھی نکالنا چاہئے"۔ انتیار احمد نے کہا۔ پھر مصطفےٰ
سے پوچھا۔ "کیا آپ کو بھی کوئی خاص مصروفیت ہے۔ آپ بھی جانے
چلتے نظر نہیں آتے"۔
"جی ہاں۔ میں تو اپنی بہن کو یہاں پہونچانے آگیا تھا۔ میرا ارادہ
بھی ـــــ" مصطفےٰ نے بات پوری نہ کی تھی۔ انتیار احمد نے کرسی پر
بیٹھتے ہوئے کہا۔
"پھر رہنے دیجئے۔ میں بھی کوئی بچہ نہیں کہ بچوں کے ہمراہ ہو لوں۔ آپ
حضرات چلیں گے تو میں چلوں گا۔ ورنہ نہیں"۔
"ہرّے۔ دفعتاً خو نے نعرہ لگایا۔ اور منھ دبا کر بیٹھ گیا۔
"دراصل وہ جگہ ہماری بارہا دیکھی ہوئی ہے"۔ مصطفےٰ بولے۔
"میں بھی ایک دو دفعہ جا چکا ہوں"۔ بازل زیر لب بولے۔
"میں تو کتنی بار جا چکا ہوں"۔ انتیار احمد نے جواب دیا۔ "جناب
والا۔ یہ صرف چند گھنٹوں کی تفریح اور مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ کسی
درگاہ شریف پر حاضری دینے نہیں جارہے ہیں۔ استخارہ دیکھنے کی

اس میں کیا ضرورت ہے۔ اچھا۔ وعلیکم السلام۔ میں چلتا ہوں۔" انھوں نے الماس کی طرف رخ کر کے کہا۔ "آپ شام تک چلی آیئے گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔ یہ کیا۔" مصطفٰے گھبرا گئے۔

بے بسی سے بازل نے حاضرین پر نظریں دوڑائیں۔ ان کا ساتھ دینے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ وہ بھی گھبرا گئے۔ نئے نویلے دولہا میاں کو ناراض کرنا اچھی بات نہیں تھی۔ لہٰذا ایک آہ سرد بھر کے بولے۔ "چلئے مصطفٰے صاحب میں کپڑے بدل کے ابھی آتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

"میں باہر گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔" مصطفٰے نے بھی راہ فرار ڈھونڈی۔ "ان حضرات کے ساتھ دھاندلی ہی چلے گی۔" افتخار احمد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "میں سُن چکا ہوں۔ دونوں مسخرے سمجھے ہیں۔ اور مجھے تو ظاہر ہے کہ یہ بولتے چالتے نہیں۔ انھیں میں ٹھیک کر دوں گا۔"

بیگم افتخار کو ہنسی آ گئی۔ "ہاں کسی نہ کسی کی ضرورت تو ہے۔ انھیں اداسی سے زندہ دلی کی طرف پھیرنے کے لئے۔"

مصطفٰے صحن کے ایک گوشے میں ہار سنگھار کے خوشبودار پیڑ کے پاس کھڑے سب کی نظریں بچا کر سگریٹ پی رہے تھے۔ اور دل ہی دل میں جز بز ہو رہے تھے۔ پھر بازل بھی لباس تبدیل کر کے آ گئے۔ الماس جو سدرہ اور شہارا کے پاس بیٹھی سسرال کی باتیں کر رہی تھیں۔ کھڑی ہو گئیں۔ سب باہر نکلے تب سدرہ نے احمد صاحب کو دیکھا۔ ہمیشہ کی طرح بے حد اداس اور فکر مند سے وہ برآمدے میں کھڑے تھے۔ سدرہ کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ وہ اتنے مغموم اور پریشان کیوں رہتے تھے۔

ان کی عمر ساٹھ باسٹھ کے قریب ضرور تھی۔ مگر وہ اسّی نوّے سال کے معمر ترین انسان معلوم ہوتے تھے۔ جیسے ایک بہت بڑے غم نے ان کی زندگی کی ساری خوشیاں چھین لی تھیں۔ کوئی ناقابل تلافی نقصان ناقابل معافی گناہ ان سے سرزد ہو گیا تھا۔ سدرہ کے سلام کے جواب میں بھی ایک بڑی حزیں مسکراہٹ سے انھوں نے اسے دعا دی تھی۔ اور خاموش سے سب کو جاتے دیکھتے رہے تھے۔ ان کی کاریں آگے پیچھے چلی گئیں۔ تب بیگم احمد ان کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ احمد صاحب نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ اور اپنے برف کے سے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

"آپ کے لئے کافی بنائی تھی۔ سینڈوچ بھی ہیں۔ یہیں لے آؤں؟" بیگم احمد نے پوچھا۔

"نہیں اب کچھ نہیں چاہتا۔ نماز کے بعد بسکٹ چائے کا ناشتہ تو کیا تھا۔" برآمدے سے ہٹ کر وہ کوچ پر آبیٹھے۔ بیوی بھی پاس آکر بیٹھ گئیں۔

"بس آپ سوچنے بھر کے رہ گئے ہیں۔" بیگم احمد نے مدھم آواز میں کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دن رات صرف ایک فکر کے ہو کر رہ جانا کس مرض کا علاج ہے۔ کیا آپکے سوچنے سے پچھلے حالات بدل جائیں گے؟"

"اسی بات کا تو مجھے غم ہے صفیہ" احمد صاحب نے ایک گہری سانس لے کر جواب دیا۔ "انسان بڑا مجبور واقع ہوا ہے۔ اس کے بس میں کچھ بھی نہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ کئی راز اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان کے ظاہر ہونے سے یہی بہتر ہے کہ وہ قبر میں ساتھ جائیں۔ کیا ایک گہرا راز ہم سے بھی

وابستہ نہیں ہے۔ اگر وہ کسی طرح کھل گیا۔ تب میں کسی کو کیا صورت دکھاؤں گا۔ تم دوسروں کے استہزا اور تمسخر کا مقابلہ کس طرح کر سکو گی۔

میں اپنا اور تمہارا انجام سوچتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔ ہمارے اپنے بچے اور خاندان والے اور خود وہ بے چاری جس کی ذات سے یہ ایک ناگوار راز وابستہ ہے۔ یہ سب۔ یہ سب کیا کہیں گے۔ کیا سوچیں گے۔ اور ہم جواب کیا دیں گے۔ کل کو اس کا کہیں سے پیغام آئے گا۔ اور اسے قبول کرنا پڑے گا۔ تب کیا ہوگا۔ کیا ہم خدا کے اور اس کے بندوں کے گناہ گار ٹھہریں گے؟"

"اللہ سب کی مجبوریاں دیکھ رہا ہے۔" صفیہ بیگم نے جواب دیا۔ "جب ایسا موقع آئیگا ہم کوئی تدبیر سوچ لیں گے۔ آپ اتنے پریشان اور مضطرب کیوں ہوتے ہیں۔ فی الحال تو کوئی ایسی بات نہیں ہو رہی۔"

"کل ہو گی۔ آج نہیں ہو رہی۔"

"کل کے غم میں آج اپنی جان آدھی کرنا تو عقلمندی نہیں ہے۔ آپ خود کو سنبھالیے۔ آپ خود ہی سب کے لئے ایک راز بنے جا رہے ہیں۔ مجھ سے سب پوچھتے ہیں کہ انجینیئر صاحب کو آخر کیا دکھ ہے۔ کہ ہڈی چمڑہ ہو رہے ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ دو ہونہار سعادتمند بیٹے۔ اور دو خوبصورت بیٹیاں۔" اتنا کہہ کر وہ دفعتاً خاموش ہو گئیں۔ کیونکہ احمد صاحب کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"کہنا تو پڑتا ہی ہے۔"

"کبھی کبھی تو میں اس قدر مضطرب ہو جاتا ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ

میں کچھ کھا کے سو رہوں۔ یا اس بے خبر بدنصیب ہی کو زہر دے دوں۔ آخری حل یہی ہے۔"

"خدا نہ کرے۔" دہشت زدہ ہو کر صفیہ بیگم نے کہا۔ "کیا آپ گم صم سے یہی سب سوچا کرتے ہیں۔ آپ نے تو میرا دل ہلا دیا۔ ارے۔ اللہ پر بھروسہ رکھئے سب اچھا ہی اچھا ہو گا۔"

"جب سے آمنہ کا خط آیا ہے۔ تب سے اور نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔"

"کیا کر لیں گی آمنہ۔ میں تو کہتی ہوں کہ آ کے لے جائیں لڑکی کو۔ وہی اچھا ہے۔" صفیہ بیگم نے کہا۔ "آپکے سامنے رہتی ہے آپکی جان عذاب میں رہتی ہے۔ اب میں ان سے کہوں گی کہ جلدی جلدی یہاں نہ بھیجیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو بھئی۔" احمد صاحب نے جلدی سے کہا۔ "جانتی ہو کہ اس سے میں کیسی بے پناہ محبت کرتا ہوں۔

...... ہاں تم ایسی کوئی بات آمنہ سے کہہ دو گی تو وہ اسے ادھر ہی روک لیں گی۔ مجھے جانا پڑیگا اس سے ملنے کے لئے۔"

"تو پھر وعدہ کیجئے کہ آپ جی سنبھالیں گے۔ اس طرح زندگی دوزخ بنانے سے کیا فائدہ۔ میں آپ کو دیکھ دیکھ کے ادھ موئی ہوئی جا رہی ہوں۔ ابھی پرسوں نرسوں بازل ہی پوچھ رہے تھے۔ کہ ابا کو کیا فکر ہے کسی سے کچھ کہتے نہیں۔ گھلے جا رہے ہیں۔ میں ان سے کیا کہتی۔ انھیں تو آپ سے یہی شکایت ہے کہ آپ اپنی پریشانیوں میں انھیں حصہ لینے نہیں دیتے۔ انھیں غیر سمجھتے ہیں۔ آپ کی یہ نمایاں فکریں خود بخود سب کو چونکا رہی ہیں۔ خدا کے لئے اسقدر اپنی جان پر نہ بنائیے۔ اللہ کوئی نہ کوئی حل اس مشکل کا بھی نکال ہی دے گا۔"

"سچ کہنا کیا تم اس سلسلہ میں بالکل فکرمند نہیں ہو" احمد صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں ہوں۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے۔ وہ نہ ہم سے غافل ہے نہ بیچاری بے خبر بچی سے۔ اس کی تقدیر میں جو ہو گا ہو جائے گا۔ فکر کرنے سے بھی مشکلیں حل نہیں ہوتیں۔ صحت البتہ تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ فکر آپ پر بیس سال سے مسلط ہے۔ آج تک کوئی فائدہ ہوا؟"

"سچ ہے۔ اب میں بھی کوشش کروں گا کہ دل کو سنبھالوں۔" احمد صاحب یہ کہہ کر اٹھنے لگے "فکریں تو دشواریاں بڑھاتی ہیں۔ میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری صحت متاثر ہو رہی ہے۔ کھوکھلا ہوتا جا رہا ہوں۔ اب میں جاؤں کچھ دیر سو رہوں گا۔ کچھ کہہ گئے ہیں بچے کب تک واپس آجائیں گے۔"

"آجائیں گے رات تک جائیے آپ آرام کیجئے۔" یہ کہہ کر صفیہ بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔ ایک لمحے تک ان کا چہرہ تکنے کے بعد احمد صاحب نے چپکے سے کہا۔

"میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا حرج ہے کہ اگر بازل سے اس کا ذکر کر کے دیکھوں۔ وہ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ شاید ایسا ہو کہ وہ کوئی حل بتا سکیں۔"

"میں سوچ کے بتاؤں گی۔ ابھی کسی سے کچھ مت کہئے" صفیہ بیگم نے کہا۔ "اولاد اپنی ہو یا پرائی اپنے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ اب آپ پہلے سے بھی زیادہ فکرمند رہنے لگے ہیں۔"

"تب کی بات اور تھی صفیہ۔" ایک گہری سانس لے کر احمد صاحب

نے کہا۔ "تب وہ بچی تھی۔ اب ماشاء اللہ بڑی ہوگئی ہے۔ اس کے مستقبل کا سوال در پیش ہے۔ کل کلاں کہیں سے اس کا رشتہ آگیا تو کیا ہوگا۔؟"

"آپ کی یہ رائے اچھی ہے" صفیہ بیگم نے کہا۔ "اطمینان سے سوچ کر بازل سے کہیں گے۔ وہ ضرور کوئی اچھا حل نکالیں گے۔"

"یہ نہیں کہیں گے کہ اتنی اہم بات ہم نے ابھی تک سب سے چھپائی کیوں تھی؟"

"کہہ کے تو دیکھیں۔ آپ تو پہلے سے اندیشوں کے پہاڑ کھڑے کر لیتے ہیں۔"

جاؤں۔ پھر سو رہوں کچھ دیر۔"

"جائیے" صفیہ بیگم نے جاتے ہوئے کہا۔ "دوپہر کو کیا کھائیے گا۔ بتا دیتے تو میں باسط سے پکوا دیتی۔ چوزے تلے رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ پراٹھے کھائیے گا کہ پھلکے۔"

"کچھ نہیں۔ اب تو میرے لئے ارہر کی دال اور پھلکے پکوا دو"

"ہائے۔ یہ بھی کوئی آپ کا کھانا ہوا۔

"اب تو یہی جی چاہتا ہے۔ چوزے دو دوزے بہت کھائیے" یہ کہہ کر احمد صاحب اندر چلے گئے۔ افسوس کی ایک سانس لے کر صفیہ بیگم بھی دالان میں آکے لیٹ گئیں۔ جتنی باتیں احمد صاحب نے کی تھیں وہ ان کے دماغی سکون کو بھی درہم برہم کر رہی تھیں۔ دیر تک سوچتی رہیں اور پھر اٹھ کر بے دلی سے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

گھر بھر میں سناٹا پڑا تھا۔

لڑکے لڑکیوں کو گئے دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ سب ناگر جونا ساگر پہونچ

چکے تھے۔ راستے بھر لڑکے لڑکیاں شور مچاتے اور کاروں کے دروازوں پر باجے بجا بجا کر اوٹ پٹانگ گیت گاتے رہے تھے۔ اگلی کار گاڑی میں ڈرائیور کے پاس مصطفےٰ اور بازل بیٹھے تھے۔ ان کے سنجیدہ چہروں پر کبیدگی کے آثار تھے۔

"اسی شور و غل سے میں بچنا چاہتا تھا۔" بے دلی سے بازل نے کہا۔ "مگر اشیار میاں کی خفگی کے خیال سے ان کا ساتھ دینا پڑا۔ رات بھر اس طوفان بے تمیزی سے نجات نہیں ملے گی۔ سالانہ امتحانات قریب ہیں۔ مجھے طلباء کو اہم نوٹس لکھانے تھے۔"

"بھائی مجھے بھی فرم کی طرف سے ٹور پر جانا تھا۔" مصطفےٰ نے کہا۔ "اب کل اتوار ہے۔ بات پرسوں پر گئی۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے بدانتظامی کا مظاہرہ اچھا نہیں لگتا۔ میں ان سب سے کہتا رہتا ہوں کہ آفس میں ڈسپلن برقرار رکھیئے۔ آج میں کسی سے کہے بغیر غائب ہوا ہوں۔"

"ایک دفعہ یہ بھی سہی!" بازل مدھم انداز میں مسکرا دیے۔ "نئے نازک رشتے دار کو خفا کرنا بھی اچھا نہیں۔"

"ہاں۔ یہی خیال تو مجھے بھی تھا۔" دوسرے سنجیدہ صاحب نے مسکرا کر فوراً اسکی تلافی کرتے ہوئے کہا۔ پھر ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو بیٹھے گاڑی کے اندر سنو نجانے کن لڑکیوں کے ساتھ گلا پھاڑ رہا تھا۔ بے تُکی... تانیں تھیں۔ بے فکر قہقہے تھے۔ وہ بے تکی آوازیں سن کر ڈرائیور تک ہنس رہا تھا۔ "لاحول ولا قوۃ۔" بازل نے زیر لب کہا۔

"استغفراللہ!" مصطفےٰ نے کار کے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ شور بے ہنگام اس وقت تھمی جب وہ لوگ ساگر کے کنارے پہونچ گئے۔

قدرت یہاں اپنے تمام تر حسن کے ساتھ بے نقاب تھی۔ پانی کی پہر دار چادر ہولناک آواز کے ساتھ رواں دواں تھی۔ ادھ کھلے دروازوں سے پانی آبشار کی صورت بہہ رہا تھا۔ ایک طرف اگر سبزہ لہلہا رہا تھا تو دوسری طرف رنگین پھولوں نے زمین پر قوس و قزح اتار دی تھی۔

"کیا خیال ہے جناب۔ ادھر ہی قالین بچھا دیا جائے یا ڈاک بنگلے چلیں گے؟" ایثار احمد نے پوچھا۔ ان کی نظریں رہ رہ کے مصطفےٰ اور بازل کے سنجیدہ چہروں پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ بار بار کسی بہانے ہنس رہے تھے۔ دونوں نوجوان مگر معمر ترین بوڑھے پاس پاس بے دلی سے پانی پر نگاہیں جمائے یوں کھڑے تھے۔ جیسے اس سے کسی جل پری یا جل بھوت کے برآمد ہونے کی توقع رکھتے ہوں۔

منیر کے دوست ساحل سے ہٹ کر دھما چوکڑی مچانے لگے تھے۔۔ لڑکیاں بھوت اور شدید رسی آبشار کو دیکھ رہی تھیں)۔ الماس چپکے سے ایثار کے پاس آکھڑی ہوئیں۔ انھوں نے سر کے اشارے سے مصطفےٰ اور بازل کی محویت کا نظارہ کرایا۔ الماس کو ہنسی آگئی۔

"بھائی جان کو آپ ہی کھینچ لائے ہیں" الماس نے کہا۔ "ورنہ وہ تو اپنے کمرے سے دالان میں بھی نہیں آتے۔"

"بہت بری بات ہے۔" ایثار نے کہا۔ "ان کی اس کیفیت کا ازالہ ضروری ہے۔ ورنہ یہ دماغی بیمار ہو جائیں گے۔ کسی لڑکی کو ڈھونڈھتا ہوں۔ جلد از جلد انھیں ایک سے دو کر دوں۔ پھر جب تین تک نوبت پہونچے گی تب آپ ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ انھوں نے الماس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور سب کی نظریں بچا کر۔۔ چٹانوں کی طرف ہو لئے۔

دوسرے بچوں کی ہو حق جاری تھی۔ ملازم ایک سطح سے ٹیلے پر اسٹوف اُن کرتے کچھ پکانے میں مصروف تھے۔ ان کے قہقہے ہوا میں دور تک اڑائے لئے جا رہی تھیں۔ ایک طرف جھولے پڑے تھے۔ ثمارا، نجمہ اور نازلی وغیرہ باری باری جھول رہی تھیں۔ سب نے اپنی اپنی پسند یادہ تفریح چُن لی تھی۔ اور اسی میں مگن تھے۔ ایک سدرہ تھی جو چھوٹے سے پتھر پر بیٹھی کبھی موجوں کا تماشہ دیکھتی کبھی اس کی نگاہیں ٹھیک بازل پر جلی جاتیں پھر اس نے دیکھا کہ مصطفےٰ نے ان سے کچھ کہا تھا۔ اور ان سے جدا ہو کر ایک گھنے درخت تلے جا بیٹھے تھے۔ وہ بھی کچھ کم آدم بیزار نہ تھے۔ سدرہ نے منہ بنایا۔ اتنا بھی تنہائی پسند ہونا کیا۔ بیچارے دکھیا بازل اکیلے رہ گئے تھے۔ پہلے تو وہ کچھ دیر تک کھڑے رہے۔ پھر وہاں سے ہٹ کر بڑے بیزار اور اکتائے ہوئے سے ایک درخت کی موٹی سی جڑ پر جا بیٹھے۔ کچھ دیر تک ان کی نظریں ان لڑکیوں پر جمی رہیں۔ جو جھولا جھول رہی تھیں اور مترنم قہقہے بکھیر رہی تھیں۔ اس خوبصورت نظارے کی دید میں خوش ذوق انسان بڑی دیر تک کھویا رہ سکتا تھا۔ مگر بازل کو ان رنگین تتلیوں کی اڑان کا نظارہ بھی اپیل نہ کر سکا۔ انھوں نے اپنے چھوٹے سے بریف کیس سے ایک کتاب نکالی اور اس میں محو ہو گئے۔

سدرہ انہی کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک وہ کوئی شرارت پر غور کرتی رہی۔ پھر آواز دے کر الماس کے سسرال کی ملازمہ لڑکی کو اپنے پاس بلایا۔ بے چاری سب سے الگ تھلگ بیٹھی حسرت سے دوسروں کو کھیلتے کودتے دیکھ رہی تھی۔ سدرہ کی توجہ سے خوش ہو گئی۔

"کہئے!" اخلاق کے مارے اس کی پوری بتیسی دکھائی دینے لگی۔

"ارے یہاں تفریح کرنے آئی ہو کہ عبادت کرنے۔ ایک طرف بیٹھی ہو بس۔" سدرہ بولی۔

"پانی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "اچھا بتائیے۔ اگر اس میں کوئی گر پڑے تو کیا ہوگا۔"

"ہوگا کچھ نہیں۔" سدرہ نے کہا۔ "بس کسی بڑی مچھلی یا مگرمچھ کا ایک وقت کا لنچ ہو جائے گا۔ مگر یہ تم ایسی بھیانک بات سوچ کیوں رہی ہو خدا نہ کرے کہ کوئی اس میں گرے۔ اچھا سنو! مجھے تمہارا اس طرح خاموش بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"چنبیلی بیگم!"

سدرہ ہنسنے لگی۔ "تمہارا نام بہت اچھا ہے۔ تم کھیلو گی میرے ساتھ۔"

"آپ کے ساتھ؟"

"ہاں۔ کیوں کیا ہوا۔" سدرہ بولی۔ "ادھر بھی تو سب کھیل ہی رہے ہیں۔"

"کیا کھیل ہے؟"

"میں آگے دوڑتی ہوں تم مجھے پکڑو تو میں چور بن جاؤں۔ پھر تم آگے بھاگنا اور میں تمہیں پکڑنے دوڑوں۔"

"اچھا!" چنبیلی بیگم نے فوراً آمادگی ظاہر کردی۔ اور اپنی دوہری بلکہ تہری کمر کے گرد دوپٹہ کس کر تیار ہو گئیں۔ ان کے بھاگنے کا تصوّر کر کے سدرہ کو ہنسی آنے لگی تھی۔ مگر ہنسی کا مطلب تھا چنبیلی بیگم کو خفا کرنا۔ چنانچہ سدرہ نے بھی اپنا حباب سا دوپٹہ کمر کے گرد باندھ لیا۔ اور بولی۔

"اچھا تو دوڑوں۔ چھو لو گی مجھے!"

"جتنا تیز جی چاہے!"

"تو پھر۔ آجاؤ!" یہ کہہ کر سدرہ نے چوکڑی سی بھری اور جانی بوجھی بے خبری میں سبز بھی بازل کے سامنے سے نکلی چلی گئی۔ اُس کے پیچھے سٹرک کوٹنے کا انجن چلا۔ مگر کہاں سدرہ کہاں یہ بھس بھرا بورا۔ بھد بھد کی آواز پر بازل نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اور پھر ناگوار انداز میں چہرہ کتاب پر جھکا لیا۔ سدرہ کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ جنبیلی کا کیا حشر ہو رہا تھا۔ سانس تیز ہو گئی تھی۔ سیاہ چہرہ سرخ ہو کر توا ہو گیا تھا۔ اور رُخ روشن پر پسینہ بہنے لگا تھا۔ پھر جس طرح بازل نے اسے دیکھ کر حیرت سے پلکیں جھپکائی تھیں۔ اس نے سدرہ کا برا حال کیا۔ جنبیلی نزدیک تو بہر حال آہی رہی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے چھو لیتی۔ سدرہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور چٹان کے پیچھے سے چکر کاٹ کر سامنے آئی۔ تیر کی طرح دوڑی اور عین بازل کے سامنے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ گری تو وہ تھی مکاری سے مگر ہوا یہ کہ سچ مچ اس کا پاؤں مڑ گیا۔ اور گھٹنا ایک نوکیلے پتھر سے لگا۔ کھال چھل گئی۔ اور اس کی شلوار گھٹنے پر سے پھٹ کر زخم میں چپک گئی۔ کچھ ذرے ریت کے بھی زخم میں گھس گئے۔ شرارت اور تقریب بہر اوقات ایک حقیقی سانحہ بن گئی۔ سدرہ کے لبوں سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ اور وہ پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی۔

بازل نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ اور اس کے پاس آکر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔

"یہ کیا ہوا؟" انھوں نے پوچھا۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ اور چہرے پر اضطراب تھا۔ "آپ کیسے گر پڑیں۔ کہاں چوٹ لگی ہے؟"

"یپ ۔ پاؤں میں ۔" واقعی کراہ کر سدرہ بولی ۔ "سید ھا نہیں ہوا جار ہا مجھ سے ۔"

"اُف ۔ آپ کے زخم بھی تو آیا ہے ۔" ان کی نگاہ اس کے گھٹنے پر پڑی جہاں پھٹے ہوئے پائینچے سے خون آلود زخم صاف دکھائی دے رہا تھا ۔ اور بہتا ہوا خون لباس کو مزید داغدار بنانے لگا تھا ۔ اتنے میں چنبیلی بھی پاس آ گئی ۔ اور حیرت سے اسے دیکھنے لگی ۔

"اتنا تیز کیوں دوڑی تھیں بی بی ۔" اس نے کہا ۔ "اب دیکھو کیا حال ہوا ہے ۔"

"یہ سب لوگ کہاں غائب ہیں ۔" بازل گھبرا کر کھڑے ہو گئے ۔ "آپ سب کے ساتھ کیوں نہ رہیں ۔ آپ کا زخم خشک ہو کر زیادہ تکلیف دے گا ۔ فی الحال اسے دھونا چاہیئے ۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ریت کے ذرّے زخم میں رہ جائیں ۔ کیا آپ کسی طرح کھڑی ہو سکتی ہیں ۔؟"

"نہیں ۔" سدرہ کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی ۔ "مگر میں کوشش کرتی ہوں ۔" اس نے زمین پر ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر ایک چیخ مار کر ایک طرف گرنے لگی ۔ گر ہی پڑتی ۔ اگر بازل نے بے اختیار اسے اپنے بازوؤں پر سنبھال نہ لیا ہوتا ۔ سدرہ کا زخم مہکتا ہوا گلاب بن گیا تھا ۔ مگر بازل کے چہرے پر وحشت اور گھبراہٹ منجمد ہو کر رہ گئی تھی یہ پھول سا بدن ، گلاب سا چہرہ ۔ اس پر پسینے کی شبنم ، خشک لب ہونٹوں سے ابھرتی ہوئی بے چین کراہیں ۔ لڑکی کی تکلیف کا احساس اور اس کے ساتھیوں کی غیر موجودگی ـــــ بازل کے لئے اس ناگہانی مصیبت سے آسان تو وہ قیامت ہوتی جو اچانک آ جاتی ۔

ہونٹ کاٹتے ہوئے انھوں نے سدرہ کو مزید سہارا دیا۔ اور بولے۔

"چلئے۔ میں آپ کو لئے چلتا ہوں۔ اُدھر سبزے پر بیٹھ جائیے! میں پانی لاتا ہوں۔ آپ کسی طرح اپنا زخم دھو لیجئے۔ اور دیکھتا ہوں۔ آپ کے ساتھی کہاں رہ گئے۔ آپ آسانی سے چل سکتی ہیں کہ نہیں؟"

فرطِ حیا و غیرت سے سدرہ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ صرف ان کی سنگین محویت کو توڑنا چاہتی تھی۔ انھیں اپنی طرف متوجہ کر کے اپنا احساس دلانا چاہتی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس طرح ایک غیر مرد کی باہوں کے حلقے میں سما جائے۔ اس کا سارا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ مگر یہ بھی سیالی آگ بن گیا تھا۔ اس کا بدن چھنک رہا تھا۔ اور دل کی دھڑکنیں اس کی رگ رگ میں بج رہی تھیں۔ وہ مارے شرم کے نیم بیہوش سی ہو رہی تھی۔

بازل نے تقریباً اسے اپنی گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور تیزی سے لا کے سبزے پر بٹھا دیا۔ پھر اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔!

"ٹھہرئیے! میں آپ کے پاؤں پر رومال باندھے دیتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مڑ گیا ہے۔ کتنی جلدی آپ کا پاؤں سوج گیا ہے۔ اسے تو کسی جراح سے ٹھیک کروانا پڑے گا۔ یہ کہہ کر انھوں نے اپنا رومال اس کے ٹخنے اور ایڑی میں کس کر باندھ دیا۔ پھر جھنجھلی سے بولے" تم ذرا جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر ان کے سب ساتھیوں کو بلا لاؤ۔ ہم ابھی واپس چلیں گے۔ میں کسی برتن میں پانی لاتا ہوں۔ جاؤ جلدی کرو۔"

انھوں نے کبھی سرخ اور کبھی زرد ہوتی ہوئی لڑکی پر نظر ڈالی۔ اور تیز تیز قدموں سے اس طرف چلے گئے۔ جہاں ملازم بہت سے برتن بکھرائے

بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ملازم خاموش ہو گئے۔ باذل نے ایک جگ اٹھایا اور باٹی سے پانی لے کر پھر تیزی سے سدرہ کے پاس واپس آگئے۔ اس کے پاؤں کی تکلیف بڑھ چکی تھی۔ وہ ہزار ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ضبط اس سے ممکن نہ ہو سکا۔ اور آنسوؤں کے موتی اس کے سُتے ہوئے رخساروں پر بہہ نکلے۔ اس نے باذل کو آتے دیکھ کر رُخ موڑ لیا تھا۔ مگر انھوں نے اسے روتے ہوئے دیکھ لیا۔

"صاحب!" چنبیلی جو حواس باختہ ہو رہی تھی۔ بولی۔ "اب کیا ہو گا بی بی کے پاؤں میں بہت درد ہو رہا ہے۔"

"ہاں وہ تو ہو گا۔" باذل نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے موچ آگئی ہے۔ میں انھیں اسپتال لے چلوں گا۔ مگر اب تم ذرا ان کا زخم صاف کرو۔ اور اپنے ڈوپٹے سے ایک دھجی پھاڑ کر زخم پر باندھ دو۔ ہم واپس چلیں گے۔ میں سب کو ڈھونڈنے جاتا ہوں۔" پھر ان کا ہاتھ بے اختیار سدرہ کے کندھے پر آکر رکا۔ "آپ روئیے نہیں۔ میں ابھی آپ کو لئے چلتا ہوں کچھ ضبط کیجئے۔" پھر انھوں نے چنبیلی سے کہا۔ "تم اپنا کام کرو۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

سدرہ انھیں درختوں کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا کی۔ اور اس کے وہ آنسو جو مارے تکلیف کے مسلسل بہہ رہے تھے۔ رک گئے۔ کیا وہ یہی چاہتی تھی؟ اس کا ضمیر اس کے کچو کے لگا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک اجنبی سے تعارف حاصل کرنے کے لئے بہت نامناسب قدم اٹھایا تھا۔ وہ تو بس ان کی ذرا سی توجہ چاہتی تھی۔ ان کے دکھ اسے اپنے دکھ معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ان کے دکھوں کا

اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب شرم و غیرت کے مارے جو آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ جسمانی "تکلیف پر کم اور روحانی اذیت پر زیادہ بہہ رہے تھے۔

"یہ میں نے بہت برا کیا" اب وہ بار بار یہی سوچ رہی تھی اور پچھتا رہی تھی۔ کتنی بری بات تھی۔ ایک غیر آدمی اپنی گود میں اٹھا کر اسے یہاں لایا تھا۔ نامحرم کے ہاتھ اس کے جسم سے لگے تھے۔ وہ احساس گناہ کے مارے پسینے پسینے ہو رہی تھی۔

اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب چنبیلی نے اسکا زخم دھویا۔ اور کب اپنے دوپٹے سے ایک پٹی سی پھاڑ کر اس کے زخم پر لپیٹ دی۔ مگر جب اس نے اس کا چہرہ دھونے کے لئے بھیگا ہوا ہاتھ اس کے منھ پر پھیرا۔ تب وہ چونکی تھی۔ بے ساختہ اسکی زبان سے نکلا تھا۔

"وہ کہاں گئے۔؟"

چنبیلی کا منھ بن گیا۔ "پتہ نہیں یہ آپ کے سارے ساتھی کیسے ہیں ایک جگہ بیٹھ کر کوئی کھیل نہیں کھیلتے کوئی کہاں گیا۔ کوئی کہاں۔ ایب صاحب ان سب کو اکٹھا کرنے گئے ہیں۔ پھر واپس چلیں گے۔"

بازل اکیلے آتے دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے گاڑی رینگ رہی تھی۔ وہ سدرہ کے پاس آکے رک گئے۔

"مصطفےٰ صاحب بھی شاید چلے گئے۔" انھوں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "اور آپ کے سارے ساتھی تما باڈاک بنگلے میں ہیں۔ یہ انھوں نے بڑی لغویت کی ہے۔ آپ کو ساتھ رکھنا چاہئے تھا۔ ٹھیک ہے۔ میں ملازم سے کہہ آیا ہوں کہ جب وہ کھانے کے لئے آئیں تو"

ان سے سارا واقعہ کہہ دیں۔ اور دیکھو بھئی" وہ چنبیلی سے بولے "تم پھولوں کے پاس جا کے ان کا انتظار کرو۔ وہ سب وہاں آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ میں انھیں لے کر شہر گیا ہوں۔ سمجھیں! سمجھیں"

چنبیلی نے سر ہلایا۔

"ہم۔ مجھے بھی آپ ڈاک بنگلے میں پہونچا دیجئے" شرم سے پانی پانی ہو کر سدرہ بولی۔ "میں سب کے ساتھ چلی جاؤں گی"

"پاؤں کی ڈریسنگ بہت ضروری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت کی وجہ سے کوئی نقص ہمیشہ کے لئے باقی رہ جائے" بازل کا لہجہ اس قدر سنجیدہ تھا کہ سدرہ پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔ انھوں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آرام سے بٹھا دیا۔ خود ڈرائیور کے پاس جا بیٹھے۔ اور اس سے بولے۔

"ذرا تیز چلنا"

وہ انہی کا ڈرائیور تھا۔ ان کے حکم پر گاڑی سنسان سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

سدرہ کے کانوں میں ہواؤں کا شور گونج رہا تھا۔ دل تھامے بیٹھی تھی۔ پچھتاوے شرم کے تازیانے بن کر اس پر برس رہے تھے۔ ہوش و حواس گم ہوئے جا رہے تھے۔ خدا نے اس کی بے باکی کی اسے سزا دی تھی۔ کیا ہوگا جب گھر پر یہ سارا قصہ سب کو معلوم ہوگا۔ مصطفیٰ غصہ ہوں گے۔ امی باتیں سنائیں گی۔ اور کیا کچھ بری بھلی اسے سننی پڑے گی۔

وہ گاڑی کے رکنے سے ہوش میں آئی بازل نے اتر کر اسے بھی سہارا دے کر اتارا۔ ان کے گرم مضبوط ہاتھ میں اس کا ننھا سا نرم و نازک موی

ہاتھ تھا۔ سرد برف کے ٹکڑے کا سا۔ بازل نے اب پہلی دفعہ نظریں اٹھا کر اسے قریب سے دیکھا۔ اور بے حد نرم لہجے میں پوچھا۔

"کیا بہت تکلیف ہے۔؟ آپ کا ہاتھ تو سرد ہو رہا ہے۔"

"میں بے حد شرمندہ ہوں۔" سدرہ دکھتا ہوا پاؤں زمین پر رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ "میری وجہ سے آپ کو کتنی زحمت ہوئی۔ معاف کر دیجئے مجھے۔"

بازل کے لبوں پر مسکراہٹ کا گمان ہوا۔ "معافی کس بات کی۔؟ کیا آپ نے جان بوجھ کر مجھے زحمت دی ہے۔ یہ تو اتفاقات ہیں۔ آیئے میں آپ کو لئے چلتا ہوں۔ ابھی جراح ڈریسنگ کر دے گا۔ تکلیف کم ہو جائے گی۔ آپ ایک ذرا سی بات کو بڑھا کے محسوس نہ کیجئے۔ اس میں شرمندگی کا ہے کی۔ کیا میں آپ کی تکلیف برداشت کر سکتا۔ آیئے!"

سدرہ تو کٹ کٹ گئی۔ وہ اسے اتفاق کہہ رہے تھے۔ اگر وہ بھانپ جاتے کہ اس نے قصداً یہ حرکت کی تھی تو اس کی عزت ان کی نگاہوں میں کیا رہ جاتی۔ پھر وہ انھیں کبھی منہ نہ دکھا سکتی۔

وہ اسے سہارا دیئے ہوئے ایک کمرے میں لائے تھے۔ یہیں جراح بھی آگیا تھا۔ اس نے بڑی توجہ سے اس کے پاؤں کا معائنہ کیا۔ پھر مرہم لگایا۔ اور کھینچ کھانچ کر پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد اطلاع دی۔

"ہڈی سرک گئی ہے صاحب! چھ پٹیاں بندھیں گی۔ پرسوں پھر آئیے گا۔"

"چھ پٹیوں کے بعد کوئی کمی تو باقی نہ رہے گی۔" بازل نے جراح سے پوچھا۔

"نہیں صاحب!" اس نے جواب دیا۔ اور ایک نسخہ لکھ کر انھیں دے دیا۔ "یہ کیپسول دن میں تین کھلا دیجیے گا۔"

"اچھا۔ شکریہ۔" بازل نے کہا۔ اور پھر اس کی طلب کی ہوئی فیس اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"چلئے۔" انھوں نے سدرہ سے کہا۔ "میں آپ کو گھر پہونچا دوں۔ آپ آرام کیجیے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ڈریسنگ ہوتی رہے گی اور پھر انشاء اللہ آپ چلنے پھرنے لگیں گی۔ مگر اب ذرا اہرنوں کی طرح چوکڑیاں نہ بھریئے گا۔ یہ کہہ کر شاید وہ ہنسے تھے مگر سدرہ میں اتنی جان ہی کہاں تھی کہ جو وہ آنکھیں اٹھا کر انھیں دیکھ سکتی۔ ان کی اس ہنسی سے لطف اندوز ہو سکتی جو شاید عرصے بعد ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز اداز چھوڑ گئی تھی۔

واپسی پر انھوں نے میڈیکل ہال سے کیپسول خریدے تھے۔ پھر گاڑی ایک کیفے کے سامنے رکوا دی۔ اپنے سٹوفر کے ہاتھ میں کوئی سا نوٹ رکھتے ہوئے بولے۔

"دو کپ فروٹ آئسکریم ہمیں دے جانا اور تمھارا جو دل چاہے لے لینا"

"آپ۔ آپ" سدرہ کا حال ابتر تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ شرمندگی کے مارے خودکشی کر لے۔

"آپ کو تکلیف ہے۔ آپ روتی رہی ہیں۔" انھوں نے کہا۔ "تھوڑی سی آئسکریم کھا لیجیے۔ بہت سکون محسوس کریں گی۔"

"میں نے آپ کی تفریح بھی غارت کر کے رکھ دی۔" سدرہ کو رونا آنے لگا۔!

"ایسی کوئی بات نہیں" انھوں نے کسی قدر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "میری کوئی تفریح صحیح معنوں میں تفریح نہیں۔ میں تو اتیار صاحب کے خیال سے آگیا تھا۔ وہ بہرا مانتے۔ مگر اس میں بھی خدا کی مصلحت تھی کہ .... لاؤ بھائی شکریہ" اچانک وہ شوفر سے مخاطب ہو گئے آئسکریم کا کپ اس کے ہاتھ سے لیکر سدرہ کی طرف بڑھا دیا۔ اور اس خیال سے کہ وہ ان کے سامنے کھاتے شرمائے گی۔ انھوں نے اس کی طرف پیٹھ کر لی بڑی مشکل سے زہر کے گھونٹوں کی طرح اس نے آئسکریم کے چمچے حلق سے اتارے۔ ان کی زحمت اور بیزاری کا خیال کر کے سدرہ پر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ لیکن تجربہ تجربہ ان کی انسانیت۔ نیکدلی۔ ہمدردی اور شرافت کے گہرے نشان سدرہ کے دل پر مرتسم ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے اس سے خواہ مخواہ کی گفتگو کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھے بھی نہ تھے۔ اس کی طرف مڑ کے دیکھا بھی نہ تھا۔ اگر انھیں سدرہ کی اذیت کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ اس سے بات چیت بھی نہ کرتے سدرہ جو پہلے ہی انھیں اپنے دل میں ایک خاص درجہ دے چکی تھی۔ اب ایک دیوتا کی طرح اپنے اچھوتے جذبوں کے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا! پہلے تو اسے ان کے دکھوں سے محبت تھی۔ اور اب دکھی سے بھی محبت ہو گئی۔

گاڑی چلی۔ تو انھوں نے گویا خود سے کہا تھا۔ "معلوم نہیں مصطفے صاحب کہاں رہ گئے۔ اور وہ سب بچے۔ اپنی تفریح میں اپنے ساتھیوں کو بھی شامل رکھنا چاہیئے۔"

"کیا ہوا تھا سرکار" ڈرائیور نے اخلاقاً پوچھا۔

"بھائی۔ یہ بچّوں کے کھیل۔" باذل نے خود کو بہت بڑا بزرگ سمجھ کے جواب دیا۔ "ایک جگہ تو بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں۔ بس پھر گر گرا پڑتے ہیں۔"

سدرہ کو تکلیف کے باوجود ہنسی آگئی۔

گاڑی سدرہ کے گھر پر رکی۔ یہاں باہر سے اندر تک سناٹا پڑا تھا! چوکیدار تک گیٹ پر موجود نہ تھا۔ باذل نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ اور ایک جھجھلتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر بولے۔ "زینے طے کرکے آپ کو اوپر جانا ہے۔ کیسے جایئے گا؟"

پانی پانی ہو کر سدرہ نے کہا۔ "آپ اگر ابّا کو بلا لائیں تو ۔۔۔!"

"بہت اچھا!" باذل نے جواب دیا۔ اور اسے گاڑی میں چھوڑ کر اوپر بڑھ گئے۔ پانچ منٹ بعد پادر صاحب، اور بیگم پادر باذل کے ہمراہ آتے دکھائی دیے۔ دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ جھپٹ کر سدرہ کے پاس آگئے۔ جو پاؤں پکڑے رونی صورت بنائے بیٹھی تھی۔

پادر صاحب نے پریشان ہو کر کہا۔ "میاں تم نے کہا تھا کہ گر پڑی ہے۔ مگر یہاں تو بینڈیج تک کرنے کی نوبت آگئی۔ کیا ہڈی ٹوٹ گئی ہے؟"

"اللہ نہ کرے۔ کوئی بات ایسی ویسی تو نہیں ہے؟" بیگم پادر گھبرا کر بولیں۔

"احتیاطاً چچا جان!" باذل نے جواب دیا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا بیٹی اترو۔ کسی طرح ہمّت کر کے۔" پادر صاحب بولے۔ "لے چلتا ہوں اوپر۔ چل کر آرام کرو۔" انھوں نے گاڑی کے دروازے میں آدھے جھک کر سدرہ کو سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ بڑی مشکل سے وہ ایک پیر پر زور دے کر کراہتی منھ بناتی باہر تو آگئی۔ مگر اس سے کھڑا

نہیں ہوا جا رہا تھا۔ دوسرا پیر زمین پر ٹکتا ہی نہ تھا۔ اس نے بے بسی سے ماں باپ کی طرف دیکھا۔ پلکیں بھیگنے لگیں۔

"ذرا سہارا دو بیگم" یادر صاحب نے بیوی سے کہا۔ "پکڑ کر اوپر لے چلیں" چنانچہ دونوں نے سہارا دیا۔ مگر اس کے باوجود ایک پیر سے پھدکنا اس کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔ وہ دونوں پر زور دینے کے باوجود آگے نہ بڑھ رہی تھی۔

"کیسے طے کرے گی بہن چلیں زینے" بیگم نے تشویش سے کہا۔

"پروردگار یہ کیا ہوا۔ لڑکی ذات ہے کوئی عیب نہ لگ جائے"۔

"امی" سدرہ منمنائی "نہیں چلا جا رہا مجھ سے"

"اچھا۔ تو ایک کرسی لے آیئے حضور" ڈرائیور نے دخل دیا۔ "اس پر بٹھا کے اور پکڑ اکے پہنچا دیں"۔

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے" یادر صاحب بولے۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں پہنچا دوں چچا جان" باذل نے کہا۔

"کیا حرج ہے" اجازت دینے کے انداز میں یاور صاحب نے کہا۔

"مگر زینے زیادہ ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں"

"لیکن آپ کو ناگوار تو نہ ہوگا"

"اس میں ناگواری کی بات کیا ہے بیٹے۔ تمہاری زحمت کے خیال سے کہہ رہا تھا"

سدرہ کا نازک بوجھ ایک بار پھر باذل کی باہوں میں آگیا۔ انھوں نے پلک جھپکتے اسے اوپر پہنچا دیا۔ ان کے پیچھے سب تھے۔ جب سدرہ ڈرام سے ایک ایزی چیئر پر لیٹ گئی۔ اور خود کو مرنے سے بچانے کے لئے

اپنی دھڑکنوں اور سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ تب یکایک یاور صاحب کو غصّہ آگیا۔

"میں پوچھتا ہوں پکنک اسی بیہودگی کا نام ہے۔ اسی گرنے پڑنے اور ہاتھ منھ توڑ بیٹھنے کا نام تفریح ہے۔ یہ اکیلی رہ گئی تھی اور دوسرے نامعقول اسے چھوڑ کر کہاں مر گئے تھے۔ فرض کرو یہ بے وقوف بہہ جاتی پانی میں تو اسے کون نکالتا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ فرشتہ رحمت کی طرح تم موقعہ پر موجود تھے۔ نہ ہوتے تو پھر یہ تڑپا کرتی۔"

"مصطفےٰ بھی تو ساتھ تھے۔" ڈرتے ڈرتے بیگم یاور نے پوچھا۔ "کیا وہ بھی دوسروں کے ساتھ ہو گئے تھے؟"

"اب جو کچھ ہو گیا اس کا کیا ذکر چچی جان۔" بازل نے معاملہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی ایسی سنگین پریشانی نہیں ہے۔ بس۔ وہ کچھ۔ ان کی ہڈی متاثر ہو گئی ہے۔ جرّاح نے کہا تھا کہ۔ چھ بینڈیج اور ہوں گے پھر یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔" انھوں نے کیپسول کا بڑا سا پیکٹ جیب سے نکال کر انھیں تھما دیا۔ "دن بھر میں تین کھلا دیجئے گا۔"

"میاں کس طرح تمھارا شکریہ ادا کروں۔" یاور صاحب بولے۔ "بڑا کام کیا ہے تم نے آج۔" انھوں نے بھی اپنی جیب ٹٹولی۔ "کہہ دیتے کہ۔ وہ جرّاح کی فیس اور کیپسول کی قیمت ـــــــ!"

"جی ہاں۔ وہ کچھ۔ دس ہزار صرف ہو گئے۔" بازل نے سنجیدگی سے کہا۔ "چھ بینڈیج میں دس ہزار مزید صرف ہوں گے۔ اس کے بعد میں آپ سے بیس ہزار کا چیک لے لوں گا۔"

"معاف کرنا بیٹے۔" بیگم نے کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا۔ اس کی کوئی قیمت

نہیں۔ ہم مصطفٰے سے بھی پوچھتے کہ ان کا کیا خرچ ہوا۔ تم اور وہ کون الگ ہو۔ اچھا بیٹے بیٹھ تو جاؤ۔ میں چائے بنواتی ہوں۔"

"جی بالکل نہیں۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔" باذل نے کہا۔ "پھر کبھی آؤں گا۔ ہاں ان کی بینڈیج پرسوں پھر ہوگی۔ ضرور لے جائیے گا۔"

"میاں تب بھی تمہی کو تکلیف کرنی پڑے گی۔" یاور صاحب نے کہا۔ "جراح کا پتہ نشان میں کہاں جانتا ہوں۔"

"اچھا جناب۔" انھوں نے کہا۔ اور بیگم یاور اور یاور صاحب کو رخصتی سلام کر کے چلے گئے۔

سدرہ کی طرف تو دیکھا بھی نہیں اس کے دل میں درد سا جاگ اٹھا۔ ان کی سنجیدگی خاندانوں میں مثالی بن چکی تھی۔ مگر اتنی بھی سنجیدگی کیا۔ جو بے رخی ہو جائے۔ سدرہ نے اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں مل ڈالیں۔

"فرشتہ ہے فرشتہ۔" بیگم یاور کہہ رہی تھیں۔ "اللہ اس کے دل کے غم دور کرے۔ مجھے تو وہ شروع سے پسند ہے۔ جب کبھی مصطفٰے سے ملنے آیا۔ میں نے دل سے یہی دعا مانگی کہ پروردگار احمد بھائی کی زبان سے کہلوا دے تو میں اپنی تارہ اسی سے بیاہ دوں۔ مگر جس کی تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے۔ وہی ملتا ہے۔"

دفعتہً زینوں پر ملی جلی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔ قدموں کی دھڑا دھڑ سنائی دی۔ اور پھر پکنک منانے والے لڑکے لڑکیاں دہشت زدہ صورتیں لئے دالان میں آکھڑے ہوئے۔

"ارے۔ یہ کیا طوطا پال لیا بھائی۔" ایثار سدرہ کے پاس بیٹھ کر بولے "ہم سے جب چنبیلی بیگم نے سارا قصہ کہا۔ تو پھر کہاں کی پکنک اور کیسی

تفریح۔ بس۔ مار امار بھاگے آئے ہیں۔ سدرہ۔ بیٹی۔ یہ ہوا کیا۔؟

"بیٹی!" سدرہ ہنس دی۔ "دولہا بھائی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔"

"میاں تم سب نے بھی تو غضب کیا تھا۔" یاور صاحب نے ان کے نئے دولہا ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے کہا۔ "نہ معلوم تم سب اور یہ بچے۔ اور مصطفےٰ سب اسے تنہا چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے تھے۔ مصطفےٰ کا تو ابھی تک پتہ نہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ وہاں بازل میاں موجود تھے۔ ورنہ معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوتا۔"

"ہم تو ڈاک بنگلے کی چھت پر چڑھ گئے تھے چچا جان۔" الماس نے کہا۔ "ہمارے ساتھ سب ہی تھے۔ پانی کا نظارہ وہاں سے بہت اچھا دکھائی دیتا ہے۔ سچ مانیئے ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ سدرہ ہم سب کے ساتھ نہیں ہے۔ ہم جب نیچے اترے تو چنبیلی نے سارا قصہ سنایا۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پھر وہاں پل بھر بھی نہیں ٹھہرے۔ فوراً بھاگے آئے۔"

"دوڑ کا مقابلہ بھی آپ نے کیا تو خود کو پی ٹی اوشا سمجھ کر بھُس بھرے بورے کے ساتھ۔" منیر بولا۔ "ارے آپ ہرن اور وہ مس ہاتھی۔ یا خدا کہیں سن تو نہیں رہی ہیں۔" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

"بہت دیر سے اس کا ذکر کئے جا رہے ہو۔" الماس نے کہا۔ "امّی سے کہوں گی۔ اسی کو بیاہ لائیں۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ دو دو آدمی اچھے پیغام کے انتظار میں بڈھے ہوئے جا رہے ہیں۔ مصطفےٰ بھائی اور بازل بھائی کے لئے ایسی ہی ہیوی پوٹا مس۔" چنبیلی بیگم چائے کی پیالیوں سے بھری ٹرے لا رہی تھیں۔ وہ بوکھلا کر چپ ہو گیا۔ سب کو ہنسی آ گئی۔

"میں پوچھتا ہوں۔ آخر یہ مصطفیٰ کہاں رہ گئے۔؟" یاور صاحب نے کہا۔
"ارے وہ آدم بیزار اسپیشل کو الٹی کے" اختیار نے کہا۔ "بھاگ لئے راہ فرار آسان دیکھ کر۔ مگر میں اب نہ انھیں بخشنے والا ہوں نہ بازل بھائی کو۔ گھیر گھار کے لے گیا تھا ذرا انہیں بولیں گے۔ لیکن ہنسنا بولنا ان کی تو تقدیروں ہی میں نہیں ہے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ مصطفیٰ بھائی آخر گئے کدھر۔"
"کیا وہ عینک لگانے والے صاحب۔؟" چونک کر چنبیلی بیگم نے پوچھا۔
"ہاں تم نے دیکھا تھا انھیں۔" الماس نے پوچھا۔
"میں ہی تو کافی لے گئی ان کو دینے۔" چنبیلی نے کہا۔
"کہاں تھے۔" اختیار نے پوچھا۔
"وہ جو پتھروں کی ڈھیری تھی نہ میاں۔" چنبیلی نے اپنی چائے طشتری میں انڈیل کر مزے میں سڑپتے ہوئے کہا۔ "جہاں سینکر کے لال پیلے پھولوں کا یہ بڑا سا درخت منڈوے کی طرح ——!"
"منظر نگاری بڑی عمدہ ہے بھابی۔" منیر بولا۔
"عقل کی پوری یہ بتاؤ کہ کیا وہ اسی درخت کے تلے بیٹھے تھے۔؟"
الماس نے جھنجھلا کر پوچھا۔
"رحمت اللہ کی دری بچھائے پتھروں کی ٹیک لگائے موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔" چنبیلی نے کہا۔
"تو بس۔ ابھی تک وہیں ٹیک لگائے بیٹھے پڑھ رہے ہوں گے۔"
یاور صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"مگر میں پوچھتا ہوں کہ ہم جب وہاں سے واپس آرہے تھے تب ہی تم نے ان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا۔" اختیار احمد نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"میاں تب آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا تو کیسے بتاتی۔ اب آپ نے پوچھا ہے تو بتا دیا" شان بے نیازی سے چنبیلی نے جواب دیا۔

"معقول بات ہے" منیر نے سر ہلا کر داد دی۔

"اب جب کتاب ختم ہو جائے گی۔ تب دیکھیں گے کہ پنجرہ خالی ہے۔ پرندے اڑ چکے ہیں" ایثار نے کہا۔ "حیران ہوں کہ واپس کیسے آئیں گے۔ ادھر تو میں نے بسیں چلتے بھی نہیں دیکھیں"

"گاڑی لے کر چلے جائیں سردار خاں صاحب" یاور صاحب نے کہا۔ "اگر انھیں کوئی بس نہیں ملی تو بڑی پریشانی ہوگی۔ میں کہے آتا ہوں"

"آپ بیٹھئے۔ میں کہے آتا ہوں" منیر اٹھ کر چلا گیا۔

سدرہ اور ثریا چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ دو تین لڑکیاں اور ان کے پاس تھیں۔ اب جب کہ ان کی تفریح رہ ہی گئی تھی۔ تو سب نے جانے کی اجازت طلب کی۔ مگر کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ بیگم یاور نے سب کو کھانے پر ٹھہرا لیا۔ ایثار اور الماس نئے دولہا دلہن تھے۔ ان کے خیال سے کچھ ڈشیں اہتمام سے تیار کروائیں۔ پھر دو بجتے بجتے بیگم یاور انھیں طعام خانے میں لے گئیں۔ سدرہ، ثریا، نجمہ، نازی اور شمسہ کے لئے کھانا تخت پر چن دیا گیا۔ بڑوں کے جانے کے بعد سب بے تکلفی سے بات چیت کرنے اور ہنسنے بولنے لگیں۔ پھر شیطان کی طرح منیر بھی انھی میں شامل ہو گیا۔

"لڑکیوں میں کیوں گھسے بیٹھے ہو" شمسہ جلبلائی۔ "تم جاؤ نا ڈرائنگ روم میں۔ سب کے ساتھ کھاؤ"

"اجی آپ لوگ جب ہر میدان میں مردوں کی برابری کی دعوے دار ہیں تو

پھر ساتھ کھانے میں شرماتی کیوں ہیں۔" مرغ مسلّم کی طرح کوفتہ کھاتے ہوئے منّو نے کہا۔

"صورت دیکھ اپنی آئینے میں اگر آئینہ ہو تو۔" جل کر نازلی بولی۔ "مونچھیں تو ابھی تک ڈھنگ سے نکلی نہیں ہیں۔ آیا کہیں سے بڑا مرد بن کے۔"

"مطلب یہ کہ میں عورت ہوں، مرد نہیں۔" منّو نے شامی کبابوں کی پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اور کیا۔" نجمہ بولی۔ "عورت بھی نہیں۔ بلکہ چھوکری۔"

"تو پھر اپنے ساتھ کھلانے میں کیا حرج ہے!" منّو نے کہا۔ اور پھر بگھارے چاول اپنی پلیٹ میں اونڈھانے۔

"بحث کرے گا بس!" یسارا بولی۔

"ایک وقت ساتھ کھانا نہیں کھلا سکتے آپ لوگ۔" منیر نے الٹی انھیں ملامت کرتے ہوئے کہا۔ "مکھی چوس بننے کی حد ہے۔ اگر کبھی آپ لوگوں کی سسرال پہونچوں گا تو خدا معلوم آدھی پیالی چائے بھی پلاتی ہیں کہ نہیں! اچھی بات ہے۔ جب انشاءاللہ میری بیگم آئیں گی تب انھیں تاکید کر دوں گا کہ کوئی بھی چھوکری دروازے پر آئے تو ادھر ہی سے ٹرخا دینا۔"

"تجھ ایسے آفاقی کے پاس کھانے کو کیوں آنے لگے۔" برا سا منہ بنا کر شمسہ نے کہا۔ "ہمیں اللہ میاں نہ دیں گے کیا۔"

"گدھے کی طرح گرتا ہے کھانے پر۔" نازلی بولی۔ "اتنا ندیدہ کنگلا لڑکا آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ غضب ہے کہ شہر میں کہیں شامیانہ لگا دیکھتا ہے تو گھس جاتا ہے وہاں۔"

"ہاں دے کوئی کان پکڑ کے ہنکاتا بھی نہیں۔" حیرت سے نجمہ نے پوچھا۔
"اجی ہنکائے گا کون۔" منوّ نے قہقہہ لگایا۔ "گھس جاتا ہوں ہمانوں میں۔ کبھی دولہا والوں کی طرف کا بن جاتا ہوں۔ کبھی دلہن والوں کا رشتہ دار سب سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ بریانی ــــ!"
"بریانی پر مرتا ہے۔ نہ دیکھے حرام نہ حلال۔ نہ یہ سوچتا ہے کہ چہلے کا کھانا ہے یا چالیسویں کا۔ بس اسے بریانی بھرنے کو دے دو۔" دِلدارا بولی۔
"چھی۔ توبہ۔ نجمہ نے کہا۔
"آپ نے وہ لطیفہ نہیں سنا۔" قہقہہ لگا کے منیر بولا۔ "ایک صاحب میرے ایسے بریانی کے مارے ہو گئے تھے۔ جہاں شامیانہ دیکھتے گھس پڑتے ایک دفعہ ایسے ہی کسی دعوت میں پہونچ گئے۔ اور اس خیال سے کہ یہ شادی یا سالگرہ کی دعوت ہے۔ صاحب خانہ سے بولے اللہ آپ کو ایسے پرمسرّت دن روز دکھائے۔ وہ بگڑ گئے۔ واہ جناب۔ خوب دعا دے رہے ہیں آپ۔ جناب یہ میرے والد صاحب کے چہلم کا کھانا تھا۔ اب بریانی زدہ محتاط ہو گئے تھے۔ چنانچہ دوسری دفعہ جب اس طرح کی مفت کی دعوت کھانے جانے لگے تو میزبان سے بڑی افسوسناک صورت بنا کے اور لہجے میں غم بھر کر بولے۔ خداوند کریم ایسے روز بد آپ کو پھر کبھی نہ دکھائے وہ صاحب آگ بگولہ ہو گئے مارنے جھپٹے۔ یہ دعوت ان کے اکلوتے بیٹے کی سالگرہ کی دعوت تھی۔"
"ایک دن تیرا حشر بھی یہی ہوگا۔" نجمہ ہنس کر بولی۔
کھانا ہو چکا تھا۔ ملازمہ برتن بڑھا لے گئی۔ اور چائے دے گئی۔ منوّ سب میں بیٹھا بکواس کر رہا تھا۔ سدرہ سے بولا۔

"یہ جو آپ نخرہ پھیلا کے بیٹھی ہیں تو اب کالج کا کیا ہو گا۔؟"

"بات کرنے کی تمیز نہیں بد معاش کو۔" سدرہ بولی۔ "کیا میں نے جان بوجھ کر پاؤں توڑا ہے۔" یہ کہتے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر آگ سی پھیل گئی۔ اسے اپنے جھوٹ پر شرم آگئی۔

"اب سبھی جہاں کے تہاں ہو رہیں گے۔" ثیبارا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ چچی جان بھی مجھے لینے آنے والی ہیں۔ سدرہ پاؤں توڑے پڑی ہیں۔ نجمہ کو پڑھائی سے اٹھا کر اس کی امی اس کی شادی کئے دے رہی ہیں۔۔۔! بے چاری نازلی اکیلی رہ گئی۔ ادھر زہرہ کا حال بھی یہی ہے۔ سنا ہے کہ اسی رجب میں اس کی منگنی کسی باہر والے آدمی سے ہونے والی ہے۔ شادی کے بعد وہ اسے لے کر کہیں چلا جائے گا۔

"آپ لوگوں کا مقدر۔" منو نے دخل دیا۔ "ادھر ہم ایسوں کی قسمت عمر بھر کا پھٹا ڈھول گلے میں ڈال لیتے ہیں۔"

"جا نکل جا یہاں سے۔ ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کو موجود رہتا ہے۔" نازلی نے چڑھ کر کہا۔ اور منیر کا کالر پکڑ کر اسے گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لائی۔ اور باہر نکال کر دروازہ بولٹ کر دیا۔

جب تک اثیار اور دوسرے لوگ کھانے سے فارغ ہو کر گھر جانے کے لئے اٹھ نہیں گئے۔ ان میں ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شام کے تین ساڑھے تین بجے اثیار نے اجازت چاہی تھی۔ سبھی کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ بیگم یاور ثیبارا اور نجمہ وغیرہ کو بلا لے گئیں۔ ایک دفعہ پھر الماس اور اور اثیار وغیرہ سدرہ کی خیریت پوچھنے آئے تھے۔ اسے آرام کی ہدایت دے کے چلے گئے۔ ثیبارا ابھی بہن بھائی کے ساتھ سدھاری۔ مصطفیٰ!

نجانے کہاں رہ گئے تھے۔ شام تک ان کی تلاش میں ناکام رہ کر ڈرائیور واپس آ گیا۔

اب گھر میں سنّاٹا پڑا تھا۔ سدرہ اپنے اچھے برے خیالوں کے ساتھ اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔

دوسرے ہی دن احمد صاحب کی بیوی صفیہ بیگم نے بیگم یاور کو گاڑی بھیج کر اپنے ہاں بلوایا تھا۔ ان کے دل سے خود لگی تھی۔ بیگم احمد کی طلبی بہانہ بن گئی۔ تیاری کرتی ہوئی یاور صاحب سے بولیں۔ "میں تو سوچ ہی رہی تھی کہ بیبار اسے مصطفےٰ کا پیام دوں گی۔ اب موقع اچھا ہے۔ بات تو ان کے کانوں میں ڈال ہی دوں۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں بیبارا کا پیغام کوئی دوسرا آ جائے۔ اتنی اچھی بچی ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

"فی الحال ایسی کوئی بات نہ کرنا۔" یاور صاحب نے کہا۔ "لڑکی لاکھ اچھی سہی مگر اپنے نصیب کی ہو بھی تو۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ کیوں نہ ہو گی اپنے نصیب کی۔؟"

"اس لئے نہ ہو گی کہ آپ نے اپنے بھائی اور بھانجی کی زنجیروں سے اپنے بیٹے کے ہاتھ باندھ دئے ہیں۔" یاور صاحب کا لہجہ برہم تھا۔ "برسوں سے اس منحوس رشتے کی تجدید کا اعلان کرتی چلی آ رہی ہو۔ اگر مصطفےٰ کے دل و دماغ نے بھی اس بات کا اثر قبول کر لیا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ فرض کرو کہ تمہارے اس رجحان کی خبر انھیں نہ ہو یا وہ اسے پسند نہ

گئیں تو پھر۔ تم احمد صاحب اور ان کی بیگم کو کیا جواب دو گی۔ اس کے علاوہ میں نے آج تک مصطفےٰ کو اپنی ذات سے دلچسپی لیتے نہیں دیکھا۔ بس وہ ہیں۔ ان کی سروس ہے اور گوشہ نشینی ہے۔ کیا عجیب لقب الحسن ہے ان کا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب غالباً عمر یونہی تمام کر دیں گے تمہارا احمد صاحب کی بیوی سے کچھ کہنا ٹھیک نہیں۔ فرض کرو کہ وہ راضی ہو گئیں اور آپ کے صاحبزادے نے یکقلم انکار کر دیا۔ تو احمد صاحب کی نظروں میں کتنی خفیف اور نادم ہو گی۔ میری رائے مانو تو پہلے مصطفےٰ سے پوچھو۔ اگر ان کی مرضی ہو تو پھر احمد صاحب سے بات کرتے کتنی دیر لگتی ہے۔"

بیگم یاور کچھ سوچ کر بولیں۔ "مگر لڑکی تو شاید اپنی چچی کے ساتھ چلی جائے گی۔ اور آمنہ بہن نے اس کا رشتہ تلاش کر لیا تو پھر۔"

یاور صاحب کو غصہ آگیا۔ "تم تو بیکار کی بحث میں میرا دماغ بھی بیکار کر کے رکھ دیتی ہو۔ ارے آج اس کی چچی تشریف لائی ہیں۔ کل لڑکی چلی جائے گی۔ پرسوں اس کا رشتہ آجائے گا۔ اور ترسوں اس کی شادی ہو جائے گی۔ کہہ تو رہا ہوں۔ پہلے اپنے لڑکے کی مرضی معلوم کر و۔ لڑکی کی شادی کہیں اور ہو کہ نہ ہو۔ مگر تمہاری توہین تو نہ ہو۔ تمہارے کہنے پر اگر انھوں نے حامی بھر دی اور دوسرے رشتے واپس کر دیئے۔ اس کے بعد مصطفےٰ نے انکار کر دیا۔ تو پھر کیا ہو گا۔ کیا احمد صاحب گرا کر پھر تو رشتے نہ منگوانے بیٹھیں گے۔ تمہارے حصّے میں صرف شرمندگی آ جائے گی۔ اچھے تعلقات خراب ہوں گے۔ اتنا سوچ لو۔"

"تو میں مصطفےٰ سے ابھی معلوم کئے لیتی ہوں۔"

یاور صاحب نے حیرت سے بیوی کو دیکھا۔ "تمھیں ہوا کیا ہے۔ کیا ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہو تم۔ کسی تمہید کے بغیر مصطفیٰ سے پوچھوگی اور وہ فوراً رضامندی ظاہر کر دیں گے۔ کیوں۔ تم جاؤ۔ وہ تمھاری منتظر ہوں گی۔ آج میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ مصطفیٰ سے میں بات کروں گا۔

"مگر آپ کو غصہ بڑی جلدی آجاتا ہے۔"

"نہیں آنے کا غصہ! اب تم جاؤ۔"

یاور صاحب پھر اخبار دیکھنے لگے۔ اور بیگم یاور جانے سے پہلے سدرہ کے کمرے میں آئیں۔ وہ پاؤں لٹکائے بستر پر بیٹھی تھی۔ ماں کو دیکھ کر بسورنے لگی۔ "امی مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ اب پیارا چلی جائے گی۔ اس کی چچی اسے لینے آئی ہیں۔ آپ پیارا سے کہہ دیجیئے گا کہ مجھ سے مل کر جائے۔ امی! آپ نے دیکھا۔ بھائی جان ابھی تک مجھے ایک بار بھی دیکھنے اور پوچھنے نہیں آئے۔"

"پریشان ہوں میں بیٹی!" بیگم یاور نے کہا۔ "تمھارے بھائی جان کے حال پر اللہ ہی رحم کرے۔ اب تو کچھ اور گم صم ہو گئے ہیں۔ کیا حشر ہو گا ان کا۔ خدا نہ کرے کہ کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی تفریح نصیب ہے۔ ایسا جوگ آخر کس لئے لے رکھا ہے۔"

"کچھ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ پکنک سے واپس کیسے آئے تھے۔ کب آئے تھے" سدرہ نے پوچھا۔ "تمھیں خبر ہی نہیں۔" انھوں نے کہا۔ "وہ نجانے کب واپس چلے آئے تھے۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہوا کہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔ جب ہم نے سردار خاں کو گاڑی دے کے بھیجا تھا!

"آپ جاتے جاتے بھائی جان کو میرے پاس بھیج دیجئے۔"
"اگر اپنے کمرے میں ہوئے تو۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"
"اچھا۔ امی!"

بیگم یاور نے جاتے ہوئے مصطفےٰ کے کمرے میں جھانکا۔ اور انھیں موجود نہ دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

وہ احمد صاحب کے گھر پہونچیں تب ان کا استقبال بڑا مخلصانہ ہوا تھا۔ صفیہ بیگم نے اپنی دیورانی آمنہ خاتون کا ان سے تعارف کرایا۔ بیگم یاور ان سے مل کر حیران رہ گئیں۔ دھان پان سی تھیں۔ جثہ کے لحاظ سے قد بھی تھا۔ سرخ و سفید رنگت، مسکراتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ۔ ان پر پان کی سرخی بمشکل چالیس کی ہوں گی۔ مگر تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھیں۔ خلوص و محبت کے غازے سے ان کا خوبصورت چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ کروڑ پتی تھیں۔ ان کے شوہر یوسف سیٹھ کا کاروبار جانے کہاں کہاں پھیلا ہوا تھا۔ دنیا کا ہر عیش و آرام انھیں نصیب تھا۔ مگر سب سے بڑی خوشی سے محروم تھیں۔ ان کی گود خالی تھی۔ ان کے بے حد و حساب کاروبار، کروڑوں کی دولت کا کوئی وارث نہ تھا۔ بہت شروع سے انھوں نے احمد صاحب کی بچی ثیبار اکو اپنا لیا تھا۔ اسے ان کے ہاں رہتے سترہ اٹھارہ برس گزر چکے تھے۔ آمنہ خاتون اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ اسے انھوں نے شہزادی بنا رکھا تھا۔ لیکن احمد صاحب اور صفیہ بیگم کے دل میں ایک پھانس ہمیشہ کھٹکتی رہتی تھی۔ کہ کہیں لوگ یہ الزام دینے لگیں کہ آمنہ خاتون کی کثیر املاک کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد ان کے حوالے کر رکھی تھی۔ یوسف صاحب کو بھی ثیبارا سے اتنی محبت تھی۔ وہ اپنے بزنس

کے سلسلے میں دنیا بھر کے دورے کرتے رہتے تھے۔ اور واپسی پر جانے کیا کیا قیمتی تحائف۔ اعلیٰ درجے کے ملبوسات اور بیش قیمت زیورات بسارا کیلئے لے آتے تھے۔ جہاں بھی ہوتے وہاں سے اس کی خیریت دریافت کروانے کے لئے تار بھجواتے رہتے۔ بسارا کی تقدیر کسی ستارے میں پوشیدہ نہ تھی۔ اس کی تقدیر کا آفتاب نصف انہار پر جگمگا رہا تھا۔ ایک خاندان اس کی قسمت پر رشک کرتا تھا۔

اب بھی بیگم یاور نے دیکھا کہ وہ بسارا کو اپنے پہلو سے لگائے کھڑی تھیں۔ اور دونوں ہی بے حد خوش معلوم ہو رہی تھیں۔

"آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔" سب اطمینان سے بیٹھ گئے تو بیگم یاور نے کہا۔ "مگر آپ کو دیکھ کر حیران ہوں۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ بہت بھاری بھر کم ضخیم شحیم خاتون ہوں گی۔ مجھے تو آپ کے سر میں ایک بال بھی سفید نہیں دکھائی دیتا۔"

"اسی لئے تو یوسف میاں لاکھ جان سے فدا ہیں۔" احمد صاحب کی بیوی نے کہا۔ "باہر رہتے ہیں تو کسی کل قرار تھوڑی آتا ہے۔ تاروں کا تار باندھ دیتے ہیں۔"

"اے بھابی بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" آمنہ کے پرکشش چہرے پر سرخی چھلک آئی۔ "اب بڑھاپے کی عمروں میں کاہے کی بے قراری۔! وہ تو اپنی بیٹی کے لئے باندھ دیتے ہیں تاروں کا تار۔"

"خالہ امی۔" دفعتہً بسارا نے بیگم یاور سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا آپ نے گاڑی واپس کر دی۔ ہے۔"

"نہیں بیٹی! وہ اس کے مکھڑے کی نظروں نظروں سے بلائیں لے کر بولیں

گاڑی کھڑی ہے۔ مجھے واپس بھی تو جانا ہے۔"

"ارے اتنی جلدی کاہے کی ہے۔" صفیہ بیگم نے کہا۔ "اب آپ رات کا کھانا کھا ہی کے جائیے گا۔ کون سا کام آپ کا گھر پر ہے۔ آرام سے بیٹھئے۔ باتیں کریں۔"

"بھابی میں تو رک جاتی مگر سدرہ میں جان پڑی ہے۔" بیگم یاور بولیں۔ "آتے وقت ہی لڑکی بسورنے لگی تھی۔ ہاں اس نے تو پیارا کو سلام بھی کہلوایا ہے۔ میں کہنا بھول ہی گئی۔"

"خالہ امی! میں اسی لئے تو گاڑی کو پوچھ رہی تھی۔" پیارا نے کہا۔ "ہماری کار بھائی جان لے گئے ہیں۔ اب میں جاؤں گی سدرہ کے پاس۔ بے چاری اکیلی پڑی ہو گی۔"

"ضرور جاؤ بیٹی!" احمد صاحب کی بیوی بولیں۔ "اس کا قصہ سن کر اتنا برا لگا۔ کھیلنے کودنے کے دن غریب کے۔ اب پاؤں باندھ کے پڑ گئی ایک جگہ۔"

"بیٹی۔ جلدی چلی آنا۔ دیر نہ لگانا۔" آمنہ خاتون نے کہا۔

"اچھا چچی جان۔" ٹی وی پر سے اپنا پرس اٹھا کے پیارا باہر بھاگ گئی۔ برآمدے میں لکڑی کی کورچ پر احمد صاحب بیٹھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح حزن و ملال کی تصویر۔ لب خشک آنکھیں ویران۔ پیارا کو دیکھ کر وہ بڑے پیار سے مسکرائے۔

ابا۔ آپ کتنے پریشان لگ رہے ہیں۔" پیارا ان کے پاس بیٹھ گئی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "ابا۔ آپ چچی جان کے آنے سے گھبرا گئے ہیں۔ ہے نا یہی بات۔ میرے ابا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ان کا

دل توڑنا اچھی بات نہیں۔ مگر آپ کہیں تو میں ان کے ساتھ نہ جاؤں۔"

"نہیں میری بچی۔ میں پریشان نہیں۔" انھوں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی اور پیار سے بولے۔ "اب ان کے ساتھ جاؤ اور یہاں رہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں گھبرانے کیوں لگا۔"

"پھر آپ اتنے اداس کیوں لگ رہے ہیں؟"

"بیٹی! درد سر کا مریض ہوں نا۔ رات سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اور تو کوئی وجہ نہیں۔ تم کہاں جا رہی ہو"؟

"اب نہیں جا رہی ابا۔ میں آپ کا سر دباؤں گی۔ کافی اور ٹیبلٹ لاتی ہوں۔ آپ کھا لیجئے اور آیئے آپ کے کمرے میں چلیں۔ آپ آرام کیجئے۔ میرا کہیں جانا ایسا ضروری نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور ان کا سر دبانے لگی۔ احمد صاحب نے ہنس کر اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔

"بس ختم ہو گیا میرا درد — اب تم جاؤ۔ مگر جا کہاں رہی ہو؟"

"سدرہ کے پاس!"

"ضرور جاؤ! غریب لڑکی کی کیفیت میں نے سنی تھی۔ بڑا برا معلوم ہوا تھا مجھے۔ تم جاؤ بیٹی!"

"پہلے آپ کمرے میں جا کر آرام سے لیٹ جایئے۔ تب جاؤں گی۔ ورنہ نہیں۔"

"مجھے اتنا نہ چاہو میری بیٹی۔" احمد صاحب کا دل بے آواز رونے لگا۔ تم نہیں جانتی۔ میں تمھارا مجرم ہوں۔ میری زندگی تک کاش تمھیں کچھ معلوم نہ ہو۔ مگر میرے مرنے کے بعد جب لوگوں کو معلوم ہو گا۔ تمھیں

اپنی ذات سے وابستہ ایک بڑے راز کا علم ہو گا۔ تو تم اپنے مرحوم باپ سے کتنی نفرت کرو گی۔ اس باپ سے جو تمہارا باپ نہیں تھا۔ آہ۔ بیٹی بڑی قابل رحم ہستی ہے تمہاری۔ بڑا مجبور ہوں میں یہ ثُمارا کے سہارے وہ اپنے کمرے میں جا کر دیوان پر لیٹ گئے۔ اور تبھی ثُمارا نے قدم بڑھائے

پادر صاحب اپنی بیوی کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں جا کے سو گئے تھے۔ چونکہ گھر میں کوئی تھا نہیں۔ اس لئے ساررہ کچھ دیر لیٹی اپنے کورس کی کتابیں پڑھتی رہی۔ پھر اسے بھی نیند آگئی۔ وہ کمپاؤنڈ میں رکنے والی کار کی زنزناہٹ سے بھی نہ جاگی۔ مگر دفعتاً اپنے کمرے سے مصطفےٰ نکلے۔ اور اپنے خوابوں کی حسین تعبیر کو سامنے دیکھ کر بُت بن گئے۔ ان سے واپس کمرے میں جایا نہ گیا۔ ثُمارا نے ہنس کر انھیں سلام کیا اور جیسی اس کی عادت تھی۔ سادگی سے بولی۔

"سچ مانئے۔ میں راستے میں یہ سوچتی ہوئی آئی تھی کہ اس دن کی طرح کہیں پھر آپ ہی سب سے پہلے مجھے نہ ملیں۔ وہی ہوا ہے۔ اگر میں اس دعا کے بجائے کوئی اور دعا مانگتی تو ضرور قبول ہو جاتی۔ پر میں دوسری دعا مانگتی ہی کیوں۔ ساررہ کیا کر رہی ہے"؟

"میں نے دیکھا نہیں" مصطفےٰ کی بھاری گونجدار آواز ثُمارا کو بے حد پسند تھی۔ "میں تو ابھی ابھی آفس سے آیا ہوں۔ آپ اس سے ملنے آئی ہیں"؟

"جی!"

مصطفےٰ مڑ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ثُمارا نے حیرت سے سوچا کہ کیا وہ اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ چلے کیوں گئے۔ جب سے اسنے

انھیں دیکھا تھا۔ ان سے باتیں کی تھیں۔ وہ اسے بہت اچھے لگنے لگے تھے کتنے شاندار وجیہہ و خوبرو آدمی تھے۔ اکثر اس نے اپنے بارے میں بڑوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کی کسی حسین لڑکی کے لئے ایک مثالی ساتھی۔ چاہیئے۔ اب اس نے سوچا۔ کیا اس کے ماں باپ، بہن بھائی کی نظر مصطفیٰ کے سے مثالی انسان پر نہیں پڑتی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ ایک بڑے عہدیدار شریف خاندان جانے بوجھے۔ انھیں سامنے رکھ کر اس کے بزرگ کسی دوسرے ساتھی کی تلاش کیوں کرتے ہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے سدرہ کے کمرے کا پردہ سرکایا اور اسے آرام سے بے خبر سوتے دیکھ کر پردہ چھوڑ دیا۔ اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ پھر باہر نکلی اور چپکے سے مصطفیٰ کے کمرے کا دروازہ بجایا۔ انھیں اطلاع دے کر واپس جانا چاہتی تھی۔

"آئیے!" مصطفیٰ کی آواز آئی۔

وہ پردہ ایک طرف سرکا کے اندر آگئی۔ مصطفیٰ آرام کرسی پر لیٹے تھے۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ انھوں نے رخ موڑے بغیر کہا۔ "بستر پر رکھ دو۔ اور سنو۔ بجو بی بی ابھی آئی ہیں۔ ان کے لئے بھی کافی اور ساتھ میں جو کچھ بھی ہو۔ سدرہ کے کمرے میں پہنچا دینا!"

"جی اچھا۔ کہے آتی ہوں ملازم سے۔"

سگریٹ مصطفیٰ کی انگلیوں سے چھوٹ گیا۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھے ہو گئے اور پھر کھڑے ہو گئے۔ حیرت ان کی سنجیدہ آنکھوں سے جھانکنے لگی۔

"معاف کیجیئے!" انھوں نے کہا۔ "میں سمجھا شکور ہے۔ اس سے میں نے کافی منگوائی تھی۔ مگر آپ ــــــ؟"

"جی ہاں ۔ سدرہ سے ملنے آئی تھی ۔ وہ سو رہی ہے ۔ کیا کروں گی ٹھہر کے اب اجازت دیجئے جاؤں گی ۔" یشارا نے کہا ۔ اور دعا مانگنے لگی وہ اسے روک لیں ۔

اتنے میں ملازم کافی لے آیا ۔ مصطفےٰ نے اس سے کہا ۔ "ایک پیالی کافی اور ۔" وہ یشارا سے بولے ۔ "آپ تشریف رکھئے ۔" انھوں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا ۔ اور پردہ سمیٹ کر ایک طرف کر دیا ۔

"آپ اتنے ادب سے مجھے آپ ۔ آپ کیوں کہتے ہیں ۔" یشارا ان کے پڑھنے کی کرسی پر ٹک گئی ۔ اور دل پذیر انداز میں مسکرائی ۔ اس کے خوشنما گالوں میں مسحور کن گڈھے پڑ گئے ۔ فیروزی رنگ کے لباس میں وہ اس شعلے کی سی دمک رہی تھی جو فانوس کے حصار میں ہو ۔ خوبصورت سیدھی سادی ۔ آنکھوں کی راہ دل میں اتر جانے والی ۔ مصطفےٰ کی نظریں اس کے بے پناہ حسین چہرے کی بلائیں لے رہی تھیں ۔ ان کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا ۔ "میں آپ کو بے تکلفی سے مخاطب کرنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں ۔"

"اتنا غیر سمجھتے ہیں آپ مجھے ۔ ؟"

"جی نہیں ۔ غیر تو نہیں ۔" لاجواب ہو کر مصطفےٰ نے کہا ۔ "لیکن اتنی زیادہ بے تکلفی بھی تو مناسب نہیں ۔"

ملازم ایک ٹرے میں کچھ لوازمات اور کافی کی پیالی رکھے لے آیا ۔

"لیجئے ۔" مصطفےٰ نے اسے پیالی تھما دی اور پھر اپنی پیالی اٹھائی ۔

"مجھے میٹھی چیزیں اچھی نہیں لگتیں ۔" یشارا نے کہا ۔ "آپ لیجئے ۔ میں صرف کافی پیوں گی ۔" پھر وہ دفعتہً ہنس پڑی ۔

"آپ ناگرجونا گر پہونچ کر کہاں کھو گئے تھے ۔ ہم لوگوں نے ڈاک بنگلے

جاتے وقت آپ کو کتنا ڈھونڈھا تھا۔ کہاں تھے آپ ؟۔
مصطفےٰ کچھ ہنس کر بولے۔ "کچھ دیر تک چٹانوں کے پیچھے بیٹھا پڑھتا رہا، پھر جب آپ لوگ مختلف تفریحوں میں مشغول ہو گئے تو ٹیکسی کی اور واپس آ گیا۔"

"سدرہ بری طرح گر پڑی تھی۔ آپ نے دیکھا ہو گا اُسے۔"

"سنا ہے کہ گر پڑی۔ دیکھا نہیں۔"

"یا اللہ۔ ابھی تک آپ نے اسے دیکھا بھی نہیں۔ کیا کہتی ہو گی دل میں ؟۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔ بازل صاحب نے بڑا کام کیا ہے۔ میں ہوتا تو میں بھی اتنا نہ کر سکتا۔"

"میں اگر سدرہ کی جگہ ہوتی، تو کیا آپ نہ کرتے ؟"

"عبادت سمجھ کے کرتا۔" انھوں نے کہا۔

یسارا کے چہرے پر شفق سی پھول گئی۔ "آپ پھر ہمارے ہاں آئے بھی نہیں۔ سدرہ کہتی ہے کہ آپ بہت کم سخن اور تنہائی پسند ہیں۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ اکیلے میں آپ کا دل نہیں گھبراتا" ؟

"میرے دوست بہت کم ہیں۔ تنہائی اچھی بھی لگتی ہے۔ مگر۔ اب۔ شاید اچھی نہ لگے۔ کیونکہ اب سے پہلے مجھے اچھے ساتھی ملے کہاں تھے۔"

"اب کہاں ملے ہیں ؟۔"

"تقدیر اچھی ہو گی۔ تو مل جائیں گے۔"

"ایک بات اور پوچھتی۔ ہم۔ مگر۔ مجھے شرم آتی ہے۔ آپ نے۔! آپ نے۔!"

اس کا سوال آسان تھا۔ مصطفےٰ سمجھ بھی چکے تھے۔ مگر انھوں نے بڑے

بھولپن سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ پھر تین سال جرمنی میں گزارے۔ وہاں سے ایم۔ ایڈ اور ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں لیں یہیں کہیں کسی یونیورسٹی میں پڑھانا چاہتا تھا۔ لیکن والد صاحب نے ایک جگہ اپلائی کر دیا تھا۔ چنانچہ اب کمرشیل انٹرپرائز بزنس آفس میں بحیثیت بزنس منیجر کام کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر انھوں نے اپنی بے ساختہ ہنسی چھپانے کے لئے بناوٹی انداز میں کھانسنا شروع کیا۔ وہ تو اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ مگر ان کا اتنا لمبا چوڑا تعلیمی تعارف سن کر یُسارا بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی مگر اس نے اپنا سوال دہرایا نہیں۔

"آپ کے لئے کافی اور منگواؤں۔" مصطفےٰ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ اب مجھے اجازت دیجئے" یُسارا نے کہا۔ میں اب جاؤں گی سدرہ سو رہی ہے۔ اسے میں نے جگایا نہیں۔ بیدار ہونے کے بعد کہہ دیجئے گا کہ میں اس سے ملنے اور اس کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔"

"بہت اچھا۔ میں ضرور کہہ دوں گا۔ مگر وہ میری خفا ہوگی کہ میں نے آپ کو روک کیوں نہیں لیا۔ کچھ دیر اور رک جائیے۔ یا میں اسے جا کے جگائے دیتا ہوں۔" مصطفےٰ کا دل یہی چاہ رہا تھا کہ وہ ان کے سامنے بیٹھی رہے۔ اور وہ اسے دیکھتے رہیں۔ انھیں شرمیلی محجوب اور مشرقی انداز کی لڑکیاں ہی پسند تھیں۔ یُسارا ان کے اس معیار سے بھی بہت زیادہ بلند نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس مشرقی تھا۔ کہنیوں سے نیچی آستینوں کا بہت پاکیزہ سا شرٹ تھا۔ بند گلا اور خوشنما دوپٹہ جس میں اس نے خود کو چھپا رکھا تھا۔ آنچل اس طرح اس کے سر پر تھا کہ کچھ پیشانی تک سرک آگیا تھا

حیا آلود آنکھیں۔ شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ باتیں کرنے کا سیدھا سادا قرینہ۔ اس نے ایک بار بھی ان سے نگاہیں ملا کے بات نہ کی تھی۔ اس کی ہر ہر ادا مصطفےٰ کو اس کا والہ و شیدا بنا رہی تھی۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان سے باتیں کئے جائے۔ نہ وہ گھر جائے نہ سدرہ جاگے۔ لیکن وہ بہت مہذّب، محتاط اور شائستہ انسان تھے۔ اپنے وقار اور معیار سے گرنا اسے کچھ باور کرانا انھیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ جب پُیارا اٹھ کر کھڑی ہو گئی تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

ڈوپٹہ کا آنچل تیزی سے اپنی مرمریں کلائی پر لپیٹتی ہوئی وہ بولی "سدرہ کو ایک دفعہ اور دیکھ آتی ہوں۔ شاید جاگ گئی ہو"

"دیکھ آیئے!"

وہ چلی گئی۔ اور وہ سوچ میں ڈوبے کھڑے رہے۔ دوسرے لمحے وہ واپس آ گئی۔

"سو رہی ہے ابھی تک!"

"میں اس سے کہہ دوں گا کہ آپ آئی تھیں!"

"یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ علیگڑھ سے میری چچی جان آئی ہیں۔ شاید میں دو تین دن بعد ان کے ساتھ علیگڈھ چلی جاؤں گی۔ پھر نجانے سدرہ سے ملنا کب ہو"

"کیا مطلب ؟ کیا آپ علیگڈھ میں رہتی ہیں۔ یہاں اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہتیں" متعجب سے مصطفےٰ نے پوچھا۔

"جی نہیں" شاید پہلی بار پُیارا کے لہجے میں جی کی کادکھ سمٹ آیا۔

"کیوں ؟ کیا وہاں پڑھتی ہیں آپ ؟ ۔ اپ جیسی کالج تو یہاں بھی ہیں!"

"ایسی بات نہیں ہے۔"

"براہِ کرم بتائیے۔ پھر کیا بات ہے؟۔"

"چچی جان کے کوئی بچّہ وچّہ نہیں ہے"۔ یُسارا نے اپنی پلکیں ان کی طرف اٹھائیں اور انھیں اپنی طرف دیکھتے پھر جھکالیں۔ اس کا دل یکبارگی دھڑک کے جیسے تھم گیا۔ بھول گئی کہ کس پیرایہ میں بات مکمّل کرنی چاہیئے۔ ہکلاتی ہوئی بولی۔ "انھوں نے۔ شاید۔ اسی لئے۔ ابّا اور امّی سے مجھے مانگ لیا اور ابّا نے مجھے دے دیا۔ بہت۔ بہت دنوں سے۔ ان کے پاس ہوں۔ بچ۔ چچا جان اور چچی جان بہت چاہتے ہیں مجھے۔ اب دیکھئے باجی کی شادی میں مجھے بھجوادیا تھا۔ مجھے واپس جانے میں دیر لگی تو بے چین ہوکر خود مجھے لینے آگئیں۔ اب میں چلی جاؤں گی ان کے ساتھ۔"

"آپ کو تو اپنے ابّا' امّی یاد آتے ہوں گے۔؟"

"یاد آتے ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔" یُسارا نے جیسے سسکی سی لی تھی۔ "مگر اب۔ آپ بھی۔ آپ بھی!" دفعتہً وہ مُڑی اور برآمدے میں بھاگتی ہوئی بیتزی سے زینے اتر گئی۔

مصطفےٰ کے قدم زمین نے جکڑ لئے تھے۔ ان کے دل میں ایک سنّاٹا سا گونج رہا تھا۔ جیسے وہ سنّاٹا سسکیاں لے رہا تھا۔

"مگر اب۔ آپ بھی۔ آپ بھی!" کیا مطلب تھا اس کا۔ انھوں نے اپنی دونوں کنپٹیاں دبالیں۔ کیا مطلب تھا اس کا کچھ اور بھی تو کہا تھا۔ مجھ سے ملنے کی دعا کیوں مانگ رہی تھی۔؟ وہ سکتہ زدہ سے کھڑے رہے۔ کہیں وہ بھولی بھالی لڑکی کچھ اور تو نہیں سوچنے لگی تھی۔

"دفعتہً احمد صاحب کا خیال آیا۔ وہ بھی انھیں جانتے ہیں۔ انھیں پسند

کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پیارا کے لئے مجھے منتخب کرلیں عجیب گورکھ دھندا ہے۔ وہ اپنے والدین کے پاس نہیں رہتی۔ اس کے مستقبل کے بارے میں فیصلے کا اختیار کسے ہو گا۔ احمد صاحب کو یا اس کے چچا کو۔ مگر خود ان کے مستقبل کی بات ان سے کرے گا کون ہے۔ ابھی تک انھوں نے شادی سے گریز ہی کیا تھا۔ صرف اس لئے کہ ماموں صاحب کی ہمہ صفت موصوف صاحبزادی ان کے گلے نہ لگا دی جائیں۔ جن کے بھاری بھر کم نام ہی سے مصطفےٰ الرحمٰن حک تھے۔ کیا ہو گا اگر یہ مہمل نسبت پختہ ہو جائے گی۔ اس دن امی کو ٹال دیا تھا۔ لیکن بار بار انھیں ٹالنا آسان نہیں ہمیشہ اپنی مرضی سے اپنے بھائی صاحب قبلہ کے ہاں کے چکر لگاتی رہتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ــــــ آگے سوچتے ہوئے مصطفےٰ کے الجھے دماغ میں چکر آ گئے۔

دفعتہً وہاں ان کا ملازم آیا۔ "صاحب آپ کو بڑے سرکار سدرہ بی بی کے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

"سدرہ جاگ گئی ہے۔"

"جی صاحب!"

"اچھا کہہ دو۔ لباس تبدیل کر کے ابھی آتا ہوں۔" اور پھر تیزی سے لباس بدل کے یاور صاحب کی خدمت میں پہونچے۔ وہ سدرہ کے پاس بیٹھے اسے سیب چھیل چھیل کر کھلا رہے تھے۔ ان کے چہرے پر خوفناک سی سنجیدگی طاری دیکھ کر مصطفےٰ کا ماتھا ٹھنکا۔ یاور صاحب بڑے شفیق باپ تھے مگر سخت گیر بھی اتنے ہی تھے۔ مصطفےٰ کو دیکھ کر سدرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

کرسی سرکا کر بیٹھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "ہیں تمھارے پاس آ نہیں

سکا۔ کام اتنا تھا کہ لمحہ بھر کی فرصت نہیں مل سکی ورنہ ——!"

"رہنے دیجئے بھائی جان!" سدرہ نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے نہیں پوچھا میرے پاس آئے بھی نہیں۔ تو کیا۔ میں مر تو نہیں گئی نا جس کسی کو میری حالت پر رحم آیا تھا۔ اس نے مجھے ——!"

"معافی چاہتا ہوں بی بی۔ انھوں نے بڑی پُر کشش ادا سے ہاتھ جوڑ دئے "مجھ سے واقعی بڑی غلطی ہوئی۔ ہاں تو بتاؤ۔ اب کیسا ہے تمھارا پاؤں۔ کچھ درد کم ہے کہ نہیں"۔

"بیٹی جسے اپنی خبر نہ ہو۔ وہ کسی اور کی خبر کیا لے گا؟" پادری صاحب نے مصطفےٰ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ان کے لہجے میں خفگی تھی۔ مصطفےٰ کا تبسم غائب ہو گیا۔ انھوں نے اپنا ہاتھ پادری صاحب کے زانو پر رکھ کر بتیابی سے پوچھا

"کیا قصور ہوا ہے۔ مجھ سے ابّا۔ خدا کے لئے بتائیے۔ آپ کی ناراضگی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بتائیے ابّا۔ خدارا ——!"

سیب کے سینے میں گھونپا ہوا چاقو واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے پادری صاحب نے انھیں دیکھا۔ اس طرح کہ مصطفےٰ کا ہاتھ ان کے زانو پر سے ہٹ گیا۔ اور وہ مجسّم استفسار بن کر رہ گئے۔

"خفگی اور ناراضی کی کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں بھی" پادری صاحب نے مدّتوں کا کھولتا ہوا لاوا ان پر نکال پھینکا۔ "مجھے آج صاف صاف اور کھلے انداز میں بتاؤ کہ آخر تمھارا نصب العین کیا ہے۔ اپنی زندگی گزارنے کا کون سا سنجیدہ اور منفعت بخش لائحہ عمل تم نے بنا رکھا ہے۔ میں خوش تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو بیٹوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ وہی میرے بڑھاپے کے ہاتھ پاؤں بن جائیں گے۔ مگر میری توقعات غلط

ثابت ہوئیں۔ بڑے صاحبزادے جو گیارہ سال سے اٹلی میں قیام فرما ہیں انھوں نے تو ہمیں فراموش ہی کر دیا۔ دل کی تسلی کے لئے صرف چار سطری خط ہی کافی ہیں۔ اور پانچ چھ ہزار روپے کا ڈرافٹ، بس ہم ان کی مدد کے محتاج ہیں۔ کیونکہ ان سے ہمارا رشتہ صرف روپے پیسے ہی کا ہے۔ اب نہ تو ہم ان سے ملنے کے مشتاق ہیں اور نہ ہم ان کی آمد کے منتظر، خیر وہ جہاں رہیں خوش رہیں۔ لیکن تم ——!" ان کی شیشہ پوش غصیلی آنکھیں مصطفےٰ کی طرف اٹھ گئیں۔ "تم تو ہمارے سامنے موجود ہو۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اپنے ماں باپ اور بہن کی فکر کرو۔ توجہ دو ہم پر بھی۔ تمہارا کام محض ملازمت کرنا اور اپنی یافت اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ کر سبکدوش ہونا نہیں ہے۔ سمجھے؟"

"آپ جو حکم دیں میں بجالاؤں!" گھبرا کر مصطفےٰ نے کہا۔ "میں آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

"بیٹے ذرا غور کیا کرو!" اب یاور صاحب نے اپنا لہجہ کچھ نرم کر لیا۔! "ماں باپ جب بوڑھے ہو جاتے ہیں تو انکی ساری آرزوئیں بس اپنے بچوں ہی سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ جس طرح تمھارے بچپن میں ہم تمھیں سجاتے سنوارتے تھے۔ تمھیں پروان چڑھانے اور تمھیں انسان بنانے میں خون پسینہ ایک کرتے اور اپنی تمام تر توجہ صرف کرتے تھے۔ اب ہم تم سے چاہتے ہیں کہ تم بوڑھے ماں باپ کی آرزوؤں کو پروان چڑھاؤ۔"

"یقیناً۔" مصطفےٰ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"صرف زبان سے اقرار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا مصطفےٰ! اب تمھیں ہماری خواہشوں کو عملی جامہ پہنانا بھی ہے۔

"فرمائیے!"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ کیا ہے تمہاری زندگی کا نصب العین"

"بنا ہوا تو ہے ابا" مصطفیٰ نے الجھ کر جواب دیا۔ "یہ سب آپ کی محبت و شفقت کا ثمر اور ———!"

ہاتھ اٹھا کر یاور صاحب نے انھیں مزید تقریر کرنے سے روک دیا۔ اور براہ راست اصل موضوع پر آگئے۔ "سنو میاں! اب ماشاءاللہ تمھاری عمر اکتیس سال کی ہو چکی ہے۔ میں اس عمر میں تین بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ تمھاری والدہ اور میری بھی یہی خواہش ہے کہ اب ہم تمھارا گھر آباد کریں۔ چونکہ اس رخ پر تم کبھی آتے ہی نہیں تھے۔ اس لئے ہم نے بھی زبان نہیں کھولی تھی۔ لیکن اب مزید تاخیر ناممکن ہے۔ تمھاری والدہ بہت اداس اور ناامید رہنے لگی ہیں۔ وہ جب تمھارے بارے میں تشویش اور فکر کا اظہار کرنے لگتی ہیں تو میں ڈر جاتا ہوں کہ یہ فکر کہیں ان کی بیماری کا باعث نہ بن جائے۔ تم جانتے ہو بیٹے۔ وہ بلڈ پریشر کی مریض ہیں۔ مسلسل دماغی فکریں ان کے لئے سم قاتل ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا تمھارا اور صرف تمھارا کام ہے۔ کہ تم انھیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو کہ ———"

"نہیں نہیں۔ ابا۔ خدا نہ کرے!" مصطفیٰ نے بھی یاور صاحب کو ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ "ایسی باتیں نہ کیجئے۔ میری زندگی بھی امی کے کام آئے تو میں دینے میں دریغ نہیں کروں گا۔ امی اور آپ مجھے اس قدر نافرمان، سنگدل اور بے پروا کیوں سمجھتے ہیں۔ ابا۔ آپ نے کبھی مجھ سے اس طرح گفتگو ہی نہیں کی۔ اور امی کی بات تو یہ ہے کہ۔ سچ کہتا ہوں کہ

امّی کی خواہش سے گریز و اجتناب محض صرف ان کے بھائی صاحب کی صاحبزادی کی وجہ سے ہے۔ امّی نے مجھ سے وابستہ تمام آرزوؤں کا مرکز اپنی بھانجی صاحبہ ہی کو بنا رکھا ہے۔ آپ کو علم ہو گا۔ مجھے تو زیادہ علم نہیں کہ ان کی ذات وصفات ——!"

"نہیں ابّا!" سدرہ جلدی سے بول اٹھی۔ "بھائی جان کی شادی ریاست باجی سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ بھائی جان ہیرا ہیں وہ پتھر۔ اور امّی اسی پتھر سے ہیرے کو چکنا چور کرنا چاہتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ ان کے بھائی کی اولاد ہے۔ ابا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ایک دفعہ امّی کے ساتھ میں ان کے ہاں گئی تھی۔ ریاست باجی اپنی سہیلیوں میں بیٹھی نیچی نیچی باتیں کر کے قہقہے لگاتی رہیں۔ ایک بار بھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئیں۔ میں گھر آ کے بہت روئی تھی۔"

"میں نے تمھیں منع کیا تھا سدرہ۔ کہ تم ان کے ہاں نہ جایا کرو۔" مصطفےٰ نے برہم ہو کر کہا۔

"میں کیا کروں بھائی جان۔" سدرہ بھی جھنجھلا کر بولی۔ "میں تو جانا نہیں چاہتی۔ مگر امّی جب بھی جاتی ہیں۔ زبردستی مجھے گھسیٹ لے جاتی ہیں۔"

"خیر وہ قصہ میں ختم کرا دوں گا۔" یاور صاحب نے کہا۔ "اب تمھاری والدہ کا رجحان خود بھی اس طرف نہیں ہے۔ وہ احمد صاحب کی چھوٹی لڑکی کے سلسلے میں تمھارا پیغام ——!"

"ابا۔ کیا سچ مچ؟" بے قابو ہو کر سدرہ یاور صاحب کے کندھے سے چمٹ گئی۔ "ابّا۔ آپ کا مطلب ہے پیارا کے ساتھ۔ ہائے وہ کتنی پیاری ہے۔ میری بھابی بن جائے گی۔ تو میں اسے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔"

مصطفےٰ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ آنکھوں میں پیار کی قندیلیں سی روشن ہوگئیں۔ انھوں نے سر جھکا لیا۔ اور کچھ دبی زبان سے بولے۔ "اگر ماموں صاحب قبلہ کے ہاں کا سلسلہ ختم ہو سکے۔ تو پھر آپ کی جو مرضی۔ امی نے احمد صاحب کی صاحبزادی کا ذکر ہی میرے سامنے نہیں کیا تھا۔"

"میرے سامنے کر رہی تھیں۔ وہ آج ہی احمد صاحب اور ان کی بیگم کو ثریا کے سلسلے میں تمہارا پیغام دینا چاہتی تھیں۔" یاور صاحب نے خوشیوں کی موسلادھار بارش میں مصطفےٰ کو نہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر میں نے انھیں منع کر دیا۔"

"آپ نے منع کر دیا۔" بھائی بہن کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"ہاں" سنجیدگی سے یاور صاحب بولے۔ "اس لئے کہ ہمیں تمہاری مرضی معلوم نہیں تھی۔ ہمیں خدشہ تھا کہ اگر تم اس رشتے سے انکار کر دیتے تو پھر ہماری کوئی صورت نہ رہ جاتی کہ ہم احمد صاحب کو دکھا سکتے۔ میرے اور ان کے گھرے مراسم ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک سنجیدہ اور نازک معاملے میں اختلاف رائے باہمی رنجش و انقطاع تعلق کا باعث بنے۔"

اتنی گاڑھی وجہ سن کر مصطفےٰ کو ہنسی آگئی۔ انھوں نے کہا۔ "آپ مطمئن رہیئے انشاء اللہ ایسی نوبت نہیں آنے گی۔"

"خدا کرے۔" یاور صاحب نے بھی اطمینان کی سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں روز دو فردا میں احمد صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اور ان کے سامنے عرض مدعا کر دوں گا۔ بڑے نیک نفس بے حد بھلے انسان ہیں وہ

مجھے امید ہے کہ وہ میری درخواست رد نہیں کریں گے۔ ہاں تم نے کبھی ان کی لڑکی کو دیکھا بھی ہے۔؟"

گلستانِ حسن کا وہ بے مثال اور خوبصورت ترین پھول کچھ ہی دیر پہلے میرے سامنے کھلا میری شامِ جاں کو معطر کر رہا تھا۔ اس چہرے کی دید میری عبادت تھی۔ وہ میرے شباب کی پہلی اور آخری تمنا ہے۔ وہ میرے تمام حسین خوابوں کی دلکش و دلفریب تعبیر ہے۔ میری زندگی کی ساری ہی رعنائیاں اس سے عبارت ہیں۔ کیسے کہوں اس کی بے پناہ محبت میں۔

بدن سے شعلے نکلتے ہیں سینہ جلتا ہے
پکارے رات کے سنّاٹے ہیں تجھے کوئی

وہ میری زیست کی مست شباب شہزادی۔ اس قابل تو ہے کہ قدم.. سجدہ طلب پر جبیں نیاز ہمیشہ جھکی رہے۔

سدرہ نے فرطِ مسرّت سے بے خود ہو کر کہا۔" بھائی جان وہ جو پکنک پر ہمارے ساتھ گئی تھی نا۔ جس نے فیروزی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ آپ کو یاد نہیں؟"

مصطفیٰ نے مسکرا کر اس طرح سر ہلایا کہ پتہ نہیں چلا۔ اثبات میں ہلایا تھا کہ نفی میں۔ یاور صاحب کے جانے کے بعد دیر تک سدرہ مصطفیٰ سے بیشمار ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔

"جب وہ تمھیں اتنی اچھی لگتی ہے تو ضرور کوشش کرنا کہ وہ تمھاری بھابی بن جائے۔" مصطفیٰ نے اپنی عادت کے خلاف ہنستے ہوئے کہا۔" اور بھابی جلدی کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں ــــــ!"

"غلام قادر کہہ رہا تھا کہ ابھی وہ آئی تھی۔ میری خیریت پوچھنے کے لئے

سدرہ بول ہی دی۔ "میں سو رہی تھی۔ آپ نے مجھے جگا کیوں نہیں دیا۔"

"تمھاری سہیلی کو تم سے ملنا ہوتا تو تمھیں خود جگا لیتیں۔" مصطفےٰ نے

کہا۔ اور اس اندیشے کے مارے کہ کہیں جھوٹ نہ بولنا پڑے۔ جلدی

سے کھڑے ہو گئے۔ "زیادہ چلنا پھرنا مت سدرہ۔ ورنہ تکلیف بڑھتی

رہے گی۔ اور تمھاری پڑھائی کا بھی نقصان ہوگا۔ اچھا!"

"جی!"

ان کے جانے کے بعد سدرہ مسرور کن خیالوں میں گم آپ ہی آپ مسکراتی رہی۔"

اس گفتگو کے بعد مصطفےٰ کا دل بھی پڑھنے میں نہیں لگا۔ لباس

تبدیل کر کے وہ اپنے واحد دوست بازل سے ملنے کالج چلے گئے۔

بازل جن سے ایک المیہ وابستہ تھا۔ وہ اپنے اسٹاف روم میں اکیلے

بیٹھے مل گئے۔ مصطفےٰ کو دیکھ کر ان کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھر آئے۔

"آپ یہاں۔ سب خیریت تو ہے۔" انھوں نے پوچھا۔

"بس یونہی نکل آیا ادھر۔" ان کے پاس بیٹھتے ہوئے مصطفےٰ نے کہا۔

"کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ آپ کا شکریہ ادا کرتا چلوں۔"

"کس بات کا شکریہ۔" بازل کے چہرے پر کی حیرت زیادہ بڑھ گئی۔!

"سدرہ کے سلسلے میں جو کچھ ــــــ!"

"ایک غیر اہم بات کا شکریہ کیا؟" بازل نے بات کاٹ دی۔ مصطفےٰ انھیں

دیکھے جا رہے تھے۔ یسارا کا خوبصورت اس کا بھائی بھی تھا۔ یسارا

کی نسائی نزاکت نے یہاں مردانہ وجاہت اور کشش کا روپ دھار لیا

تھا۔ یوں تو ہمیشہ ہی مصطفےٰ اور بازل ایک دوسرے کے دوست تھے۔

لیکن کبھی اتنی گہری نظروں سے مصطفےٰ نے ان کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس

وقت وہ کتنے اپنے اپنے سے لگ رہے تھے۔

دفعتاً باذل نے بھی سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "سچ کہئے کیا بات ہے۔ اس طرح کالج بند ہو جانے کے بعد تو آپ کبھی یہاں نہیں آئے تھے۔"

"سچ کہہ رہا ہوں بھائی۔" مصطفیٰ نے کہا۔ "یونہی چلا آیا تھا۔ مگر کالج بند ہو چکا ہے تو آپ کیوں یہیں بیٹھے رہ گئے ہیں۔ گھر نہیں گئے۔؟"

ایک آہ بھر کر باذل نے کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک نکالی۔ "کیا کرنا گھر جا کے میرے بھائی۔ کہیں جی نہیں لگتا میرا۔ گھر ہو کہ کوئی ویرانہ۔ میرے لئے سب برابر ہیں۔ اُجڑ چکا دل کا سکون۔ چھن چکی مجھ سے میری زندگی۔ ہر جگہ اپنے دل کا قرار ڈھونڈھتا پھرتا ہوں۔ اور سمجھتا بھی ہوں کہ اب وہ ملنے والا نہیں۔"

"تو پھر اس سعی لاحاصل سے حاصل کیا؟" مصطفیٰ نے کہا۔

"دیوانگی۔ وحشت۔" باذل نے کہا۔

"اس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

"فائدہ۔ ہر بات میں فائدہ مت دیکھا کرو میرے دوست! جو لطف کچھ کھو بیٹھنے اور اس کی تلاش میں ہے۔ وہ کچھ اور ہی ہے!"

"بعض نقصان ایسے ہوتے ہیں باذل۔ جن کی تلافی کبھی ممکن نہیں۔ کچھ قیمتی چیزیں اس طرح کھو جاتی ہیں کہ شاید مر کر بھی نہیں ملتیں!" مصطفیٰ نے کہا۔ "اور یہ دیوانگی، وحشت، جستجو، تلاش، خود پر اور خاص کر دوسروں پر ظلم تو بے شک ہے۔ دانشمندی اور حسنِ سلوک شاید نہیں۔ باذل۔ غم آدم کی میراث ہے۔ یہ پیغمبروں کا ورثہ ہے کسی کو اس کا حصّہ کم ملتا ہے کسی کو زیادہ۔ موت نے کس کے دروازے پر دستک نہیں دی میرے بھائی۔

اور میرا تو ہمیشہ سے یہی اعتقاد رہا ہے کہ کسی کی موت پر غم صرف وہ شخص کرے جسے خود مرنا نہ ہو۔ غم تو بے شک فطری تقاضہ ہے۔ لیکن اسی کے ہو کے رہ جانا ان سب کی حق تلفی ہے۔ جو زندہ ہیں اور تمہاری توجہ اور محبت کے طلبگار رہیں؟"

"سب مزے میں ہیں مصطفٰے!" بازل نے جواب دیا۔ "یہاں کون ہے جو غم بدیدہ کا غم بیٹا تا ہے؟"

"یہ تو تم بڑی ناانصافی اور بے رحمی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔" مصطفٰے نے کہا۔ "شاید تم نے آج تک ہوش و ہمدردی کی آنکھیں کھول کر چچا جان کا چہرہ۔ ان کا انداز۔ ان کا طرزِ حیات نہیں دیکھا۔ نہ کبھی تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ۔ وہ تم سے کیا چاہتے ہیں۔ تمہارا غم کہیں ان کے دل پر سے تو نہیں گزر رہا ہے۔ تم نے مرحوم منگیتر کی یاد و غم میں بوڑھے اور کمزور باپ کی ساری امیدوں کو ڈبو دیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم کئی کئی دن ان کے پاس نہیں جاتے ہو۔ چچا جان کی خیریت ان کے دکھ درد سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔ اپنی ماں کی آرزوؤں اور تمناؤں کی طرف سے تم نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ بازل یاد رکھو جس طرح اب تمہیں کبھی فضہ ملنے والی نہیں۔ اسی طرح قیامت تک دوبارہ چاہنے والا باپ، ممتا نثار کرنے والی ماں بھی ملنے والی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں فضہ کا نعم البدل کسی دوسری شکل میں مل جائے۔ مگر ماں باپ کا نعم البدل کبھی کسی موڑ پر تمہیں نہیں ملے گا۔"

"مجھے خوفزدہ نہ کرو مصطفٰے!" بازل پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھنے لگے۔ "میں تو یونہی بہت پریشان رہتا ہوں۔ آج تم کیسی باتیں کر رہے

ہو۔ سچ بتاؤ۔ یہ تمہید کس بات کی ہے۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ میرے ابّا اور امّی بخیریت تو ہیں نا۔؟ تم کوئی بری خبر سنانے تو نہیں آئے ہو۔ مصطفےٰ۔ مصطفےٰ! کوئی خبر مجھے اب نہ سنانا۔ میرے دوست۔ میرے بھائی۔ اب میں سن نہ سکوں گا۔ سہہ نہ سکوں گا۔ سچ کہتا ہوں۔ مر جاؤں گا۔"

دفعتہً انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مصطفےٰ ہکا بکا رہ گئے۔ مگر انھوں نے بازل کو رونے دیا۔ منانے سمجھانے کی کوشش نہ کی۔ جانے کب کا غبار تھا جو آنکھوں کے راستے سے آنسو بن کر بہہ رہا تھا۔ وہ شاید کسی دوست کے سامنے اسطرح پہلی بار ہی روئے تھے۔ جب ان کی سسکیاں تھمنے لگیں تو مصطفےٰ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بس۔ بھائی بس کرو۔ تمہارے آنسو اتنے ارزاں نہیں جو اس طرح ضائع ہوں۔ ان آنسوؤں کا سبب میں بنا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں شرمندہ ہوں۔"

بازل نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔ اور مصطفےٰ نے اپنے رومال سے ان کا چہرہ پونچھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ بازل کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکوں پر نمی چمک رہی تھی۔ مصطفےٰ نے انھیں اپنے سینے سے لگا لیا۔

"وعدہ کرو مجھ سے بازل کہ یہ تمہارے آخری آنسو تھے۔" انھوں نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ بازل نے ان کے کندھے سے سر اٹھایا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے خشک لبوں پر لرزنے لگی۔ "تم وہ پہلے دوست ہو مصطفےٰ جس کے سامنے میں نے دل بھر کے آنسو بہائے تھے۔

بس۔ ایک بوجھ تھا میرے دل پر بھائی، وہ تم نے ہلکا کر دیا۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اب کبھی اتنا بے ضبط نہیں ہوں گا۔ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ واقعی اپنے دکھوں میں اتنا خود فراموش ہو چکا تھا کہ ابّا اور امّی کی بے چارگی پر نظر نہیں کر سکا۔ اب سوچتا ہوں تو ابّا کا چہرہ سامنے آتا ہے اُف! میں نے انھیں سچ مچ بہت دکھ دیئے۔ بے چارے میرے ابّا کتنے پریشان، اداس اور مضمحل رہتے ہیں۔ شاید میرے ہی بارے میں سوچتے رہے ہوں۔ کبھی کبھی کتنی رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے تھے۔ اور امّی بے چاری وہ تو روتی تھیں میرے سامنے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنا آنچل پھیلا دیا تھا۔ کہا تھا مجھ سے بیٹے اپنی زندگی کی بھیک ڈال دے میرے آنچل میں۔ تیری خوشیوں کے سوا تجھ سے کچھ نہیں مانگتی میں اتنا بے درد بے حس اور ظالم ہو گیا تھا کہ۔ امّی کے آنسوؤں سے بھی نہیں پسیجا تھا۔ مصطفےٰ میں گناہ گار ہوں۔ اپنے ماں باپ کا۔ مجھے خدا کبھی معاف نہ کرے گا۔ میں نے سب کے دل دکھائے ہیں۔ ایک مُردہ کی محبت میں، میں نے زندوں کی محبت اپنے دل سے نکال پھینکی تھی۔ میں تمھارا شکر گزار ہوں۔ مصطفےٰ! تم نے مجھے پھیر دیا۔ موت سے زندگی کی طرف ماں باپ کی طرف۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے۔ واپس ہو جاؤں گا۔ ابّا اور امّی کی طرف اور پھر کبھی اس ہستی کا نام نہ لوں گا۔ جو کھو چکی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عدم کے اندھیروں میں!"

"غم زندگی کی رعنائی ہے بازل۔" مصطفےٰ نے کہا۔ "غم بھی ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ آدمی کی زندگی کا اساس ہی غم پر ہے مگر اسی ایک جذبے کے ہو کے رہ جانا عقلمندی نہیں۔ فضہ کو اس طرح فراموش

کر کے اس کی محبت سے بے وفائی مت کرو۔ مگر یہ سوچ کر ـــــ

عشق تجھ محبوب کے مر جانے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

اکثر غم کے بیج سے خوشیوں کے لالہ زار کھل اٹھتے ہیں۔ تم نے اس بیج کی آبیاری بھی خوب کی ہے۔ اب اس بہار کا انتظار کرو جو تمہاری زندگی میں آنے والی ہے۔"

مصطفےٰ کو ہنستے دیکھ کر بازل بھی مسکرائے تھے۔ اب سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ کالج میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وسیع کمپاؤنڈ میں زرد زرد دھوپ کی چادر پر درختوں کے لمبے لمبے سائے چپ چاپ لیٹے تھے۔ سناٹے کا دل صرف فوارے کی آواز توڑ رہی تھی۔

دونوں باہر نکلے۔

ایک طرف سے چوکیدار لپکتا ہوا آیا۔ اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا پھر بازل سے بولا۔

"کیا آپ یہیں تھے حضور!۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ آپ نے گھنٹی بجا کے مجھے بلا لیا ہوتا سرکار۔ میں آپ کے لئے کینٹین سے کافی یا چائے لے آتا۔ اب کیا آپ جا رہے ہیں صاحب!"

"نہیں!" مصطفےٰ نے جواب دیا "ابھی جا نہیں رہے ہیں۔ تم دو کپ آئسکریم لے آؤ۔" انھوں نے پچاس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ بہت خوش تھے۔ بازل کو دوسری مسرور کن زندگی اگر ان کی وجہ سے مل سکتی تو اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

چوکیدار آئسکریم کے دو بڑے کپ ٹرے میں رکھے ہوئے لے آیا۔

اب بازل اتنے افسردہ اور مغموم نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ اور مصطفےٰ کو اس بات کی خوشی تھی!

چوکیدار جب کپ واپس لینے آیا تو پچاس روپے کا چینج مصطفےٰ نے ٹرے ہی میں چھوڑ دیا۔ اور اس کے کندھے پر تھپکی دے کر بولے۔

"ہماری طرف سے ایک آئسکریم تم بھی کھالینا۔"

اور بازل کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئے۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" مصطفےٰ نے اپنی گاڑی کے پاس پہونچ کر پوچھا۔

"گھر!" بازل مسکرائے۔ اور اپنی کار کا پٹ کھولتے ہوئے ہنس پڑے۔ دونوں کاریں باہر نکلیں اور مخالف راہوں پر چل پڑیں۔

جب کبھی سال دو سال میں آمنہ خاتون احمد صاحب کے ہاں کا چکر لگا لیتی تھیں۔ اپنے ساتھ بہت سی دلچسپیاں بھی لیتی آتی تھیں سنجیدگی سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ہنسنے ہنسانے اور سیر سپاٹے گھومنے پھرنے کی شوقین۔ ان کے آنے سے احمد صاحب کے گھر میں بہار سی آگئی تھی۔ رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں۔ احمد صاحب بھی انمیں شامل ہو جاتے تھے۔ لہٰذا زبردستی انھوں نے آمنہ خاتون کو چند دن اور رکنے پر راضی کر لیا تھا۔ ان دنوں وہ سب لوگ بازل میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ پہلے وہ صرف اپنے کمرے تک محدود رہتے تھے۔ ان کا کھانا اور چائے انکے کمرہ میں پہونچائی جاتی تھی۔ اب وہ سب کے ساتھ طعام خانے

میں کھانے لگے تھے۔ انھوں نے احمد صاحب کی بھی دیکھ بھال اس طرح شروع کر دی تھی کہ انھیں خصوصی توجہ کا احساس ہو جائے۔ اور وہ ہو بھی گیا۔ چنانچہ آمنہ خاتون نے ان سے کہا۔

"احمد بھائی! سب میری برکت ہے۔ میں ہی بازل کو اپنی محفلوں میں کھینچ لائی ہوں۔ اب آپ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے۔ لگے ہاتھوں کسی اچھی لڑکی سے بیاہ دیجیے۔ زندگی میں کوئی نئی دلچسپی پیدا ہو تو بھول جائیں گے بے چارے مرحومہ کو۔ آپ لوگوں نے بھی تو حد کر دی کبھی شادی بیاہ پر زور دیا ہی نہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" احمد صاحب نے کہا۔ وہ کچھ خوش نظر آ رہے تھے۔ "میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ بڑی نمایاں تبدیلی ہو گئی ہے۔ کل رات کو وہ میرے لیے پسندیدہ بسکٹ۔ مالٹورا۔ ہارلکس اور مکھن کے کیک لائے۔ شریف کو ہدایت کی کہ میں جو چیز مانگوں مجھے فوراً دی جائے۔ کالج سے بہت سی کتابیں اور پرچے میرے پاس رکھ گئے۔" پھر ہنس کر انھوں نے اپنے بیان میں اضافہ کیا۔ "رات کو غالباً ایک بجا ہوگا۔ میں پانی پینے اٹھا تھا۔ ابھی لائٹ آن کی تھی کہ چلے آئے۔ اور پوچھا کیا مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ میں نے کہا کہ میں پانی پینے اٹھا ہوں۔ مگر انھیں یقین ہی نہیں آیا۔ اپنے کمرے سے ہیئر آئل اٹھا لائے اور میرے سر میں تیل لگایا۔ اس وقت تک پاس بیٹھے رہے جب تک کہ میں نے سو جانے کی اداکاری نہ کی۔"

"اللہ ان کا مزاج بدل دے۔" صفیہ بیگم نے کہا۔ "اللہ ایک اچھی لڑکی بھی دلا دے۔ میں گھر میں بہو لاؤں۔"

"کوئی لڑکی دیکھی بھی ہے بھابی ؟" آمنہ خاتون نے پوچھا۔

"وہ اس طرح پر آتے ہی کب تھے۔ جو لڑکی دیکھتے" صفیہ بیگم نے کہا۔

"خیر۔ اب دیکھیں گے!" احمد صاحب نے کہا۔ "اللہ نے چاہا تو مل بھی جائے گی!"

پھر دن اچانک زیادہ خوبصورت ہو گئے۔ آمنہ خاتون کی آمد کی خبر پاکر اثیار احمد اور الماس بھی آ گئے۔ الماس میکے آئی تو اس کی پرانی دوست سدرہ کی بڑی بہن تارہ بھی سسرال سے آ گئی۔ تب تو دھما چوکڑی میں اضافہ ہو گیا۔ الماس اور تارہ کی باتیں۔ بازل اثیار اور مصطفٰے کے سنجیدہ قہقہے۔ منیر نے ان کے قہقہوں کو سنجیدہ قہقہوں کا نام دیا تھا۔ مصطفٰے کو اثیار کھینچ لائے تھے۔

احمد صاحب کے گھر میں دن عید تھے۔ رات شب برات۔

اتوار کا دن تھا۔ سب کا جمگھٹا لگا تھا۔ تارہ نے کہا۔ "ایسا برا لگ رہا ہے۔ بے چاری سدرہ ~~لنگڑی بنی پڑی ہے~~۔ اب تو دس بارہ دن ہو چکے ہیں۔ اس کا پاؤں کچھ ٹھیک ہو چلا ہے۔ کسی طرح غریب کو بھی یہاں لے آتے۔ ترستی ہے۔"

"میں نے تو کل کہا تھا۔ آپ کو پیٹھ پر لاد کر لئے چلتا ہوں۔" منیر بولا۔

"مجھے کھانے دوڑیں۔ احسان ماننا تو الگ رہا۔"

"ضرور اسے بلاؤ بیٹی"۔ احمد صاحب نے کہا۔ "کوئی اسے گاڑی میں لے آئے کیا پیدل چلنا تھوڑی ہے۔ میں مصطفٰے سے کہوں گا شام کو آئیں گے ساتھ میں اسے بھی لیتے آئیں۔" اس عرصہ میں کئی بار احمد صاحب۔ تارا اور آمنہ خاتون سدرہ کو دیکھ آئے تھے۔ اب وہ قدرے ٹھیک تھی۔ بازل دعا کے

باوجود ڈیڈی بدنوانے تو آگئے تھے۔ اسکے والد پتہ پوچھ کر جراح کے وہاں سدرہ کو لے گئے تھے۔ تین چار پٹیاں بدلی جا چکی تھیں سدرہ جسمانی طور پر ٹھیک تھی مگر روحانی طور پر مضمحل ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے غیر شعوری طور پر بازل کا انتظار رہتا تھا۔ مگر وہ ادھر کا راستہ ہی بھول چکے تھے۔ سب کے ہمراہ آتے بھی نہ تھے۔ سدرہ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ اسکا ضمیر اسے بے چین کر رہا تھا اس نے ایک بے خبر شریف آدمی کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ چنانچہ جب مصطفےٰ نے اس سے کہا کہ انہیں احمد صاحب نے بلایا ہے تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ اور منہ چھپا کر پڑ گئی۔

"جب تک مجھے کوئی بلانے نہیں آئے گا۔ نہیں جاؤں گی۔"

اس کا جواب سن کر احمد صاحب اور صفیہ بیگم ہنسنے لگے تھے۔

ثمارا اور الماس تیار ہو گئیں۔ "ہم لاتے ہیں اسے۔ سچی۔ اس کی خفگی بجا ہے۔" الماس نے کہا۔ "سب نے اسے بھلا رکھا ہے۔"

پھر الماس تو نازرہ سے باتوں میں الجھ کے رہ گئیں۔ ثمارا اکیلی چلی گئی۔

سدرہ کا عجب حال تھا۔ میلا کچیلا لباس پہن رکھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سو بیماروں کی ایک بیمار بنی بیٹھی تھی۔ ثمارا اس کے لپٹ گئی۔ تب سدرہ رونے لگی۔

"جانے والوں سے کیسی دوستی ثمارا! تم محبت بڑھا کر جدا ہو جاؤ گی۔ تم وہاں خوش رہو گی۔ مگر یہاں تمھاری جدائی۔ کا دکھ میری جان لے لے گا۔ اسی لئے میں مل کر بچھڑنے والی، بس کر اجڑ جانے والی محفلوں میں شریک نہیں ہوتی۔ تم جاؤ گی ثمارا۔ اپنی محبت بھی لیتی جاؤ۔ پہلے

بھی میری کوئی سہیلی نہ تھی۔ اب بھی یونہی تنہائی کی زندگی کاٹ دوں گی۔"

"ایسی دل خراش باتیں نہ کرو سدرہ۔" نیّارا نے اس گالا آنسوؤں میں بھیگا گال چوم لیا۔ "میں سچ کہتی ہوں کہ تم سے جدا ہو جانے کا صدمہ مجھے بہت ہے۔ مگر مجبور ہوں کیا کروں۔ کبھی کوئی سبیل نکالو کہ یہیں رہ سکوں۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ میں کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتی۔"

"میری نکالی ہوئی سبیل پر چپ چاپ سر جھکانے کا وعدہ کرو تو ابھی نکالوں۔" سدرہ نے کہا۔ "اچھا وعدہ۔ بتاؤ۔" نیّارا ہنس دی۔

"پھر مکر نہ جانا۔"

"کہو تو تم۔"

"میری بھابی بن جاؤ۔" سدرہ نے کہا۔ "پھر تم کہیں نہ جا سکو گی۔"

"کیا ہے؟" نیّارا کے رخساروں پر گلاب سے کھل گئے۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔

"ہاں۔ نیّارا!" سدرہ نے کہا۔ یقین کرو۔ پہلی دفعہ جب میں نے اور امی نے تمھیں باجی کی شادی میں دیکھا تو مبہوت رہ گئے تھے امی تو آنکھوں آنکھوں میں تمھاری بلائیں لے رہی تھیں۔ میں نے تبھی تمھیں بھائی جان کے لئے پسند کر لیا تھا۔ امی سے کہا بھی تھا کہ تمھیں چچا جان سے مانگ لیں۔ اب بھی امی ابا کی یہی مرضی ہے۔ تمھیں معلوم نہیں۔ ابا کی مرضی بھی یہی ہے۔ انھوں نے بھائی جان سے تمھارے بارے میں گفتگو کی تھی۔ بھائی جان نے بھی ان کی بات مان لی۔ اب تمھارے علیگڈھ جانے سے پہلے ہی امی چچا جان سے کہیں گی۔ کاش وہ مان لیں۔ تب میں تو مر جاؤں گی خوشی کے مارے۔ نیّارا سچ بتاؤ۔ کیا بھائی جان

تمہیں پسند ہیں؟"

تیارا نے اپنا گلابی چہرہ اٹھایا۔ شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری ہوئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے سر ہلایا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

"میری تیارا، سچ" سدرہ اس سے چمٹ گئی۔ تیارا اپنا حجاب مٹانے کے لیے بولی۔ "چلو اقرار کروا لیا تم نے۔ اب اٹھو۔ چلو میرے ساتھ۔ کہو، کون سے کپڑے نکال دوں؟"

سدرہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہے ایک بات جو میں تمہارے گھر نہیں جاؤں گی۔"

"کیا بات ہے؟" تیارا حیرت سے بولی۔ "مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟"

"تم سے نہیں چھپاؤں۔ میں تو تم سے کہنا ہی چاہتی تھی۔" سدرہ نے "مگر تم کسی سے مت کہنا تیارا! جب میں گری تھی۔ تب۔ تب۔ بازل بھائی نے کتنی ہمدردی کی تھی مجھ سے۔ ساتھ لے گئے۔ بینڈیج کروایا۔ اور اب اتنے دن ہو گئے۔ انگلیوں پر گن گن کر گزارے ہیں میں نے۔ ان کی راہ تکتے ہوئے ان کا انتظار کرتے کرتے۔ مگر وہ نہیں آئے۔ پھر مڑ کر پوچھا ہی نہیں۔ کہ سدرہ زندہ بھی ہے کہ مر گئی۔ جب انھیں مجھ سے اتنی نفرت ہے تو میں ان کے گھر کیسے جاؤں؟"

"پاگل ہو تم" تیارا، سدرہ حیران تھی۔ "ارے تم انھیں نہیں جانتی ہو۔ درویش صفت آدمی ہیں۔ اپنی ہی خبر انھیں نہیں ہے کسی اور کو کیا پوچھیں گے۔ بھئی تم ان کی دوست ہو کہ میری۔ ان سے کیا لینا دینا۔ تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ نکال دوں کپڑے۔ کب کی جوگن بنی

بنی بیٹھی ہو۔" اسے ہنسی آگئی۔ جھینپ کر سدرہ بولی۔ "اچھا نکال دو۔ ہم کرتے نہ نکالنا۔ بس سید ھے سا دے۔"

وہ سدرہ کو بڑی مشکل سے زینے سے اُتار کر اپنے ساتھ تو لے گئی مگر گڑیا پھوریخ کر اپنے بھائی پر بگڑ اٹھی۔

"آپ کا بھی جواب نہیں۔ یا تو گودی میں لاد کے اسے یہاں وہاں لئے پھرے۔ اتنی ہمدردی دکھائی اور پھر مڑ کے بھی نہیں دیکھا۔ وہ تو رو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ جب تمہارے بھائی کو میری خیر خیریت سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تو میں گھر نہیں چلوں گی بڑی مشکل سے ہاتھ جوڑ کے لائی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں بھائی جان۔ ایسی بھی کیا آپ کی بے رُخی۔ رُلا کے چھوڑا میری سدرہ کو!"

"میں نے رلا دیا" بازل نے حیرت سے کہا۔ "میں کیوں رلاتا۔ بلکہ وہ رو رہی تھیں۔ میں نے ان کے آنسو پونچھے تھے۔ اس کا یہ بدلہ کہ تم سب نے ڈانٹیں کھلوا دیں۔ واہ بھئی۔ الٹی شکایتی ہو گئیں۔ احسان تو گیا۔ وہ آپ کو بہت چاہتی ہے بھائی جان۔" بات کی گہرائی تک پہونچے بغیر شارا نے کہا۔ "اتنی اچھی ہے ایسی پیاری سہیلی ہے میری۔ اب تو میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ کیسے رہوں گی اس کے بغیر؟"

"اسی لئے تو میں نے کسی کو دوست نہیں بنایا۔ کون کب جدا ہو جائے پتہ نہیں بڑا صدمہ ہوتا ہے لیسارا۔ اب تم اپنی سہیلی سے کنارہ کشی اختیار کرو۔"

"جی ہاں" طنزیہ لہجے میں شارا بولی۔ "اور پھر آپ کی طرح پھروں یوسف بے کارواں ہو کر۔ سنئے تو بھائی جان کسی کا دل دکھانا اچھی بات نہیں۔ آپ نے اپنی بے رُخی سے سبکو بہت دکھ دئے ہیں۔ اب آپ سبکی طرف پلٹ آئیے

"چھارا نے ان کے دل کے زنگ آلود تاروں کو ایک بار پھر مضرابِ محبت نغمہ زن کر دیا تھا۔ وہ تو کچھ کہہ کے چلی گئی تھی، مگر بازل دیر تک بیٹھے کچھ سوچتے رہے تھے۔ مآلِ زندگی کیا تھا۔ ان کے ذہن میں ایک لافانی شاعر کے مصرعے گونجنے لگے۔

یہ زندگی یہ زندگی کے فلسفے
یہ لاحقے یہ سابقے
تمام ہرزگی تمام بوریت

ماہیت
یہ ہاؤ ہو یہ اختلافِ ماو تو
بس اک خواب ہی تو ہے
نظر سراب ہی تو ہے
فضول ہیں یہ کاروبارِ دنیوی
نہیں ہے جن میں حسنِ معنوی
مجھے یونہی تباہ حال رہنے دو
یہ داستانِ تلخیِ مآل رہنے دو

ان کی نظریں دیوار گیر تصویر پر پڑیں۔ ان کی مرحوم منگیتر اپنی متاثر خوبصورتیوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

کہاں گیا وہ حسنِ تبسم۔ وہ تکلم۔ ارمانوں کا جہاں۔ تمناؤں کا جزیرہ اور خواہشوں کا ہجوم۔ سب کچھ مٹی کے پردوں میں گم ہو گیا۔ بس یہی ہے زندگی اور اسی قدر ہے حیاتِ انسانی کا افسانہ

"نہیں خستہ!" انھوں نے گہری سرد آہ بھر کر کہا۔ تم میری دنیا سے نکل چکی ہو۔ اب خدا کے لئے میرے دل و دماغ سے بھی نکل جاؤ۔ تمھاری یاد و محبت کے آنسو بہت بہا چکا ہوں۔ زندگی بھر بہاتا رہوں گا۔ تب بھی محبت کا وہ حق ادا نہیں ہو گا۔ جو میں ادا نہ کر سکا۔ میرے جذبے مخلص ہونے تو بھرت میرے ہاتھوں سے تمھیں چھین نہ سکتی۔۔ کاش ساوتری کی روح اس کے عشق کا کچھ حصہ مردوں کو بھی ملا ہوتا۔ مرد کی چتا پر زندہ جلنے کا منصب عورت ہی کو کیوں عطا ہوا ہے۔ اس ایثار سے مرد کیوں محروم ہے۔؟

پھر ان کے دماغ میں پیارا کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگے۔ معلوم نہیں ان لڑکیوں میں کیا کچھ باتیں حماقت کی ہوا کرتی ہیں۔ مگر خلش سی جگا دیتی ہیں۔ کیا واقعی وہ بے وقوف سی لڑکی روئی تھی میرے لئے۔ بعض سلوک پتھر کی لکیر کی طرح لوح دل پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ بھی ایسی ہی جذباتی ہے۔ کیا بکواس کر کے چلی گئی تھی پیارا۔

"آپ کو بہت چاہتی ہے بھائی جان۔ مڑکے دیکھئے اسے بھی جو آپ کی بے رخی پر آنسو بہا چکی ہے۔"

انھوں نے پریشان ہو کر انگلیاں اپنے بالوں میں الجھا لیں۔ اور میز پر سر اوندھا لیا۔

اندر گھر میں سناٹا طاری تھا۔ ٹی وی لاونج میں ایک کین چیئر پر لیٹے مصطفےٰ۔ گوری کی ماں پڑھ رہے تھے۔ یاور صاحب احمد صاحب کے کمرے میں تھے۔ آمنہ خاتون، صفیہ بیگم اور یاور صاحب کی بیوی کی کانفرنس کچن میں ہو رہی تھی۔ جہاں ملازمہ عورتیں بھی بیویوں کے

مسائل میں بڑی دلچسپی سے حصّہ لے رہی تھیں۔ عورتوں کے پاس اولاد کی
شادیوں کے اہم معاملے کے سوا دوسرا معاملہ ہی کیا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ
ملازمہ عورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ وہاں رشتے ناطوں پر مدلل۔ سنجیدہ اور
بے حد دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی۔ جس کے پیچھے صرف بنیاد نہ تھی۔ مگر عمارت
کئی منزلہ بن رہی تھی۔

صحن میں ثِمار اکھڑی تھی۔ اور امرود کے گھنے پیڑ پر منیر چڑھا ہوا امرود
توڑ توڑ کر بیگ میں بھر رہا تھا۔ کچھ نیچے پھینک رہا تھا جسے ثِمارا اور
تارہ کا لڑکا دوڑ دوڑ کر اٹھا رہے تھے۔ تارہ کے چھوٹے تین سال کے
بچے کو منیر اپنے ساتھ درخت پر چڑھا لے گیا تھا۔ اور اسے ایک موٹی
سی شاخ پر اس طرح پاؤں ادھر ادھر کر کے بیٹھا دیا تھا۔ جیسے گھوڑے
پر بیٹھتے ہیں۔ تارہ دیکھ نہ سکیں۔ وہ اور الماس کسی کمرے میں گھسی
ہمیشہ کی طرح نجانے کن کن باتوں میں گم تھیں۔

بازل جب دالان میں آئے تو انھیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ چونکہ سدرہ
بے چاری معذور ہو چکی تھی۔ اس لئے ثِمارا کے کمرے کے دروازے
پر کرسی پر بیٹھی صحن میں دیکھ رہی تھی۔ جہاں ثِمارا اور تارہ کا بچہ امرود
اٹھا اٹھا کر ایک باسکٹ میں جمع کر رہے تھے۔

دفعتہً بازل کے اندر آ کے تخت پر بیٹھتے دیکھ کر سدرہ کے سفید ہوتے
ہوئے چہرے پر گہری سُرخی پھیل گئی۔ اس نے سر جھکا لیا دل ہی دل میں
خود کو برا بھلا کہنے لگی۔ کہ اٹھ کر بھاگ نہیں سکتی۔ اس نے سوچا تھا کہ
بازل یہاں کسی کو نہ دیکھ کر پھر اپنے کمرے میں واپس چلے جائیں گے۔
مگر ان کو تخت کے گوشے پر بیٹھتے دیکھ کر اس کا دل زور زور سے

دھڑکنے لگا۔

بازل اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ "آپ مجھ سے اتنی خفا ہیں کہ سلام کرنے کی بھی روادار نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ اپنے وعدے کے مطابق آپ کی خیریت دریافت کرنے نہ جا سکا۔ خیر آپ بتایئے کیا حال ہے۔ آپ کے پاؤں کا۔ کتنے بینڈیج ہو چکے ہیں۔ اب آپ کچھ چل پھر سکتی ہیں کہ نہیں۔"

"جی!" سارے سوالوں کے جواب میں سدرہ کی کانپتی ہوئی زبان سے نکلا۔

"جی کیا۔" بازل نے مسکرا کر پوچھا۔

"ابھی۔ تت۔ تین پٹیاں اور باقی ہیں۔" یہ کہتے کہتے سدرہ کو اپنی شرارت یاد آ گئی۔ اور شرمندگی کے مارے اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔ وہ ضبط بھی نہ کر سکی۔ دو شفاف آبی لکیریں اس کے گالوں پر بہہ نکلیں۔

بازل کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ "آپ رونے کیوں لگیں؟ انشاء اللہ آپ کا پاؤں ٹھیک ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر آپ چلنے پھرنے لگیں گی۔ اور وحشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اس جذباتی منظر کا نظارہ تو نہیں کر رہا تھا۔ وہ مارے گھبراہٹ کے کھڑے ہو گئے۔

"سنیئے!" سدرہ نے ہچکی سی لی۔ "مم۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"جلدی سے کہہ دیجئے۔" بازل کی وحشت بڑی دلچسپ تھی۔ اب وہ بدہ کر ان کے چہرے پر سرخ و سفید رنگ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

جان بوجھ کر سدرہ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کر دیجئے۔ میں جان بوجھ کر گری تھی۔"

کیا مطلب؟ جان بوجھ کر۔ میں نہیں سمجھا"۔ بازل پھر بیٹھ گئے۔

"بڑا بوجھ ہے میرے دل پر۔ بے حد شرمندہ ہوں۔ آپ کے سے نیک، رحمدل انسان کے ساتھ میں نے بہت بری حرکت کی تھی۔"

سدرہ نے کپکپاتی اور شرم سے لرزتی آواز میں کہا۔ "میرا ضمیر ملامت کر رہا ہے۔ میں احساس جرم کے مارے کئی راتیں سو نہ سکی۔ میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ آپ دوبارہ میرے پاس نہیں آئے۔ ورنہ۔ ورنہ میں ہاتھ جوڑ کے آپ سے کہتی کہ آپ۔ مجھے معاف کر دیجئے۔"

"سدرہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیسا آپ کا جرم اور کیسی میری معافی؟"۔ بازل حیران تھے۔

"آپ۔ آپ کی ساری باتیں مجھے معلوم تھیں۔" دل کا غبار نکالنے کی خاطر سدرہ نے کہا۔ "آپ کتنے دکھی ہیں۔ فضہ باجی کی یاد آپ کو چین نہیں لینے دیتی۔ آپ ہمیشہ مغموم رہتے ہیں۔ گم صم رہتے ہیں۔ مجھے بے حد دکھ ہوتا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ۔ آپ کے سارے غم مجھے مل جائیں اللہ میاں آپ کو خوش کر دیں۔ مگر میں کیا کر سکتی۔ آپ کے لئے۔ اس دن آپ ہمارے ساتھ گھومنے پھرنے چلے تو تھے۔ مگر آپ نے کسی تفریح میں حصہ نہیں لیا۔ آپ گم صم، خاموش، اداس سے ایک پتھر پر بیٹھے رہ گئے تھے۔ سب لوگ گھومنے پھرنے چلے گئے۔ آپ کو کسی نے نہیں پوچھا۔ تب مجھے بڑا برا لگا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی بھی طرح آپ کو دوسری

طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ شاید آپ کا دھیان بٹ جائے۔ اور پھر یہ سوچ کر میں آپ کے سامنے سے دوڑی تھی۔ میرا منشا آپ کو متوجہ کرنا تھا۔ سچ مانیئے۔ میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر مجھے سزا ملی میں گر پڑی۔ پاؤں ٹوٹ گیا اور۔ اور آپ کو میری تکلیف کم کرنے کے لیئے خود اتنی تکلیف اٹھانی پڑی"۔ اس نے ایک ہچکی لی اور ہوش و حواس پر بجلیاں گرانے والی بھیگی بھیگی پلکیں ان کی طرف۔ اٹھائیں۔ اور بابو کا دل خلش آمیز انداز میں دھڑکنے لگا۔ ان کے دماغ میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔ ان کا غم تو ان کے ماں باپ، بھائی بہن سب کے دلوں پر سے بھی گزر رہا تھا۔ مگر اس طرح تو کسی نے بھی غم بٹانے کی کوشش نہ کی تھی۔ پھر انھیں سدرہ کی اذیت اس کی معصومیت اور اپنی بے رخی کا خیال آیا۔ یک بیک کوئی شیریں سا درد ان کے دل میں جاگا۔ اور وہیں منجمد ہو گیا۔ انھوں نے ایک درد مند نظر اس ایماندار اور باضمیر "لڑکی پر ڈالی اور بڑے دلپذیر انداز میں مسکرانے لگے۔ پھر انھوں نے اپنے لہجے میں دنیا بھر کا پیار سمو کر جواب دیا۔

"اس میں مجھ سے معافی مانگنے اور آپ کے شرمسار ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو آپ کی ایک ہمدردانہ شرارت تھی۔ جس نے واقعی کچھ دیر کے لئے مجھے غم جاناں سے نجات دلا دی تھی۔ مگر اب نہیں کہہ سکتا کہ وہ نجات دیرپا ثابت ہو گی کہ ــــــ بہر حال میں تو آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے بے حد ہمدردی سے میری اداسی اور دلگیری محسوس کی"۔ "آپ مجھے کس قدر مکار اور ڈھونگ باز سمجھتے ہوں گے"۔

سدرہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

بازل ہنسنے لگے۔ "نہیں تو خدانخواستہ۔ آپ تو بہت اچھی ہیں۔ مکّار تو وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو دل کی بات دل میں رکھ لیتے ہیں اور دوسروں کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹی سچّی باتیں کرتے ہیں۔ آپ ایک ایماندار، شریف اور مخلص لڑکی ہیں۔ یہ خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیجئے کہ میں آپ کو ــــــ"

دفعتہً صحن کے بڑے دروازے سے تارا کے شوہر سعید نے آواز دی۔

"کہاں ہیں آپ سب۔ کوئی نظر نہیں آ رہا بھئی کیا بات ہے۔ چچی جان مدعو تو کرتی ہیں مگر مہمانوں کے استقبال کے لئے موجود نہیں رہتیں۔"

سب اپنی اپنی جگہوں سے یوں نکلے جیسے پرندے آشیانوں سے نکلتے ہیں۔

"بیٹے ہوش کی دوا کرو" صفیہ بیگم نے کہا۔ "تم اس گھر کے داماد ہو کر اللہ نہ کرے کوئی مہمان۔ اب گھر کے بڑے بوڑھے بچّوں کے استقبال کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے ہوا کریں گے۔"

"چچی جان! یہ مقولہ یاد رکھئے کہ بیٹے ایک طرف اور صرف ایک داماد ایک طرف!" سعید نے کہا۔

"اور کیا۔ داماد حضرات کے قدم ہمیشہ سسرال والوں کی گردن ہی پر رکھے رہتے ہیں۔" الماس نے کنکھیوں سے اینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سالی جی! آپ کی چونچ بند رہے تو مناسب ہے۔ میں چچی جان کو مخاطبت کی سعادت بخش رہا ہوں۔" سعید نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اس طرح میرا حق بنتا ہے کہ مانگ کر اچھے کھانے کھایا کروں۔"

"ضرور ضرور" صفیہ بیگم کو تارہ بھی پیاری تھی۔ اس کے لحاظ سے سعید بھی

عزیز تھے۔ ہنس کر بولیں۔ "جو کہو دکھا دوں۔ تم ہو ہی بے مروت۔ ہفتوں تو جھانکتے تک نہیں۔ اور پھر الزام ہمیں پر رکھتے ہو۔ کہ ——— !"

"یہ فرمائیے۔ آپ نے خود کو بیٹیوں کی صف سے کیوں الگ کر لیا ہے؟۔" بازل جو ان کے پاس جا کھڑے ہوئے تھے۔ ہنس کر بولے۔

سعید نے اپنی آنکھیں مل کر انھیں دیکھا۔ اور سینے پر ہائے اللہ کے انداز سے ہاتھ رکھ کر بولے۔ "میں صدقے۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ بازل بھائی کے موتی ایسے دانت۔ جب سے میں نے سسرال میں ہوش کی آنکھیں کھولی ہیں۔ آج پہلی دفعہ بازل بھائی کو ہنستے دیکھا ہے۔ ارے کوئی ہے نمک بھوسی لائے۔ میں ان دانتوں پر سے نظر اتار دوں گا۔"

"بیٹھو تو میاں۔" مصطفےٰ نے کہا۔ "اور ایسی باتوں سے پرہیز کرو کہ دوسرا داماد بھی تمہارے کہے میں آ جائے۔ چند دن دونوں مہمان رہ جائیں گے تو ساری مرغیاں بے چاری آپ ہی دونوں پر سے قربان ہو جائیں گی۔ چچی جان انھیں گھر سے بھگانا ہو تو دال روٹی کے سوا کچھ نہ پکائیے گا۔"

سعید جان بوجھ کر انتیاز کے پاس بیٹھ گئے۔ ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیا۔ اور سرگوشی میں بولے۔ "تم تو ابھی قطعی ننھے ہو۔ مطلب یہ کہ بالکل تازہ۔ جتنا گھسیٹنا ہو گھسیٹ لو۔ پرانے ہو جاؤ گے تو پھر کوئی کھوٹی کوڑی کو نہیں پوچھے گا۔" ان کی نظریں آمنہ خاتون کی طرف اٹھ گئیں جو باورچی خانے سے نکل رہی تھیں۔

"ارے۔ آپ چچی جان۔ معاف کیجیے گا۔ آپ کو دیر سے سلام کر رہا ہوں۔ کب تشریف لائیں آپ۔؟" وہ لکھنوی انداز میں جھک کر انھیں سلام کرنے لگے۔ آمنہ خاتون نے ان کے گال چھو کر دعائیں دیں۔

"بیٹے۔ مجھے تو آئے بہت دن ہو گئے۔ تم کہو اچھے تو ہو؟" آمنہ خاتون نے ہنس کر کہا۔

"جی۔ بالکل مزے میں ہوں۔" سعید نے ہنس کر اور فوجیانہ انداز میں اکڑ کر کہا۔ "اچھا۔ آیئے چلیں آپ کے سوٹکیسوں کی طرف!"

"اے میاں۔ کیوں۔ میرے سوٹکیسوں کی طرف کیوں۔؟" آمنہ خاتون بولیں۔

"چھ سات سوٹوں کا کپڑا تو آپ بہر حال میرے لئے لائی ہوں گی!" سعید نے کہا۔ "اکیلے میں چپکے سے دید یجئے گا۔ ورنہ اپنی حماقت سے تازہ اور بالکل فریش داماد کو تکھار چڑھا چکا ہوں۔ کہ گھسیٹ لو جتنا گھسیٹنا ہو۔"

"اللہ جانتا ہے۔ تمھاری ایسی اپنائیت بھری باتوں سے کتنی خوشی ہوتی ہے۔" آمنہ خاتون نے کہا۔

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ اور میں آپ کو زیادہ سے زیادہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" سعید نے کہا۔

"بھائی! اگر دال نہ گل رہی ہو تو میں بھی آجاؤں۔" ایثار نے دور سے ہانک لگائی۔

"غضب کرتے ہو تم لوگ بھی۔" مصطفیٰ نے کہا۔ "یہ مانگ مانگ کے۔!"

"مصطفیٰ بھائی براہ کرم آپ کو نفیسٹ نیشل معاملات میں نہ بولیں تو اچھا ہے۔ ابھی آپ بدقسمتی سے بیٹے ہی بنے ہوئے ہیں۔ خوش قسمتی سے کسی کے داماد نہیں بنے۔" سعید نے ان کی بھی ٹانگ لی۔ آپ کو کیا معلوم کہ سسرال والوں سے کھینچنے میں کتنی عمر بڑھتی ہے۔" سب ہنس رہے تھے۔

"ابّا آرہے ہیں" یسارا بولی۔ اور قہقہوں میں بریک لگ گئے۔

وہ سب احمد صاحب اور یاور صاحب کو آتے دیکھ کر مؤدب ہو بیٹھے۔
اب دالان میں تقریباً سب ہی تھے۔ ایک طرف پاؤں لٹکائے بدرہ بھی بیٹھی تھی۔ ہر طرح کی فکر و خلش سے آزاد۔ مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔

اچانک مصطفےٰ کی نظر صحن کی طرف اٹھ گئی۔ انھوں نے منیر اور تارہ کے ننھے سے بچّے کو امرود کے درخت پر چڑھا دیکھ کر ڈانٹنا شروع کر دیا۔
"اترآؤ۔ بدمعاش! اگر پڑو گے۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائے گا۔" پھر انھوں نے تارہ کو بھی ڈانٹ دیا۔ "اپنی بے معنی بکواس میں تم لوگ اس قدر محو ہو جاتی ہو کہ بچّوں کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ دیکھ رہی ہو بالشت بھر کے بچّے کو وہ باجی اوپر چڑھا لے گیا ہے۔ اب وہ بیٹھا ہے بے سہارا ایک شاخ پر۔ تارہ۔ میں کہتا ہوں۔ خدانخواستہ وہاں سے نیچے آئے تو کیا حشر ہوگا اس کا۔"

"ہائے اللہ بھائی جان!" تارہ نے سہم کر اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ اور درخت کے نیچے آکھڑی ہوئیں۔

احمد صاحب اور یاور صاحب بھی صحن میں آکھڑے ہوئے تھے۔ اور طرح طرح سے منّو کو پھٹکار رہے تھے۔

"اتر نیچے۔ خبیث!" یاور صاحب چنگھاڑنے لگے۔ "آج شرارتوں کا مزہ چکھاتا ہوں تجھے۔"

"صاحب! میں تو تھک ہار چکا۔" احمد صاحب نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اسی شیطان کے بچّے نے کل تازہ اخباروں کی کشتیاں بنا کے بچّوں کو دی تھیں۔ وہ سب انھوں نے صاف پانی میں تیرا کر پانی

غارت کر دیا۔"

"شیطان کا بچہ۔" پادر صاحب کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اولاد انہیں کی تھی۔ بھولے بھالے احمد صاحب کو کبھی اتفاق سے نیا ڈ کی غصہ آتا تو وہ ایسی ہی بے ضرر سی گالیاں دیا کرتے تھے۔ جو انہی پر آپڑتی تھیں۔

"سنبھل کے اترو" دانت پیس کر تارہ نے منوں کو گھونسہ دکھایا۔ "آج تیرا قیمہ نہ بنایا تو کچھ نہ کیا۔ بد معاش، کمینے، خود تو اوپر تک چلا ہی گیا تھا۔ اسے کمیوں لے گیا اپنے ساتھ۔ ذرا نہیں ڈرتا۔ اوپر سے پاؤں پھسلے تو کیا ہوگا۔" منیر تین سال کے صحت مند بچے کو مشکل سے سنبھالتا ہوا احتیاط سے اتر رہا تھا۔ مگر ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ آدھی دور پہونچ کر اس نے تارہ سے کہا۔ "قیمہ نہ بنانے کا وعدہ کیجئے تو اترتا ہوں۔ نہیں تو واپس جاتا ہوں اوپر۔ بہت امرود ہیں ابھی۔ ہم دونوں کو مہینہ بھر کافی ہو جائیں گے۔

"تم پہلے بچے کو دے دو مجھے"۔ بازل گرجے۔ "خبردار سنبھل کے۔ پہلے امرودوں کا تھیلا کندھے سے اتار کر نیچے پھینک دو۔"

"بھائی جان۔ خدا کے لئے مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے۔" منیر بولا۔ "اس موٹے حرام خور اور امرودوں کے تھیلے کا وزن برابر ہے۔ میں کہیں اس موٹے بھینسے کو نہ پھینک دوں تھیلا سمجھ کر۔"

"تیرا ستیاناس ابلیس!" صفیہ بیگم نے اسے گھونسہ دکھایا۔

خدا خدا کر کے منیر نیچے اترا۔ امرودوں سے بھرا تھیلا زمین پر پھینکا اور ساتھ ہی بچے کو بھی ایک طرف لڑھکا کر بھاگنا چاہتا تھا کہ لپک کر مصطفےٰ نے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"اب لگاؤں کس کس کے دو ہاتھ"۔ انھوں نے ہاتھ بے شک اٹھایا مگر لگایا آدھا ہاتھ بھی نہیں۔ "توبہ کرو کہ پھر کبھی ایسی حرکت نہ کروگے۔ گر پڑتے اوپر سے تو پھر کیا حشر ہوتا۔"

"میں ایسی حرکت کبھی نہیں کرتا"۔ منّو نے توبہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے امّی چڑاتی ہیں درخت پر کے سارے امرود نگوڑے طوطے کھائے جارہے ہیں۔ توڑلاؤ۔ کچھ کچا لو ہی بنا کے کھائیں گے۔ میرا کیا قصور ہے۔"

"بدذات۔ جھوٹا موا"۔ صفیہ بیگم بولیں۔ "میں تو کہتی ہوں کہ درخت ہی کٹوا دیا جائے"۔

بہر حال یہ حادثہ ٹلا تو پھر سب ایک جگہ بیٹھے۔ باتیں کرنے اور ہنسنے بولنے لگے۔ احمد صاحب کے گھر میں بے موسم عید آئی تھی۔ منّو جاکے دیبا را اور سدرہ کے پاس بیٹھ گیا۔ اور ان کے ساتھ امرود کھانے لگا۔ پھر سدرہ کی طرف دیکھ کے بولا۔ "تیمور رنگ۔ اب کیا ارادے ہیں۔ پڑھائی سے بچنے کے لئے بہانہ تو اچھا مل گیا مگر اس کے بعد کون سی چیز توڑو گی — ؟ پڑھنا تو تمھیں ابھی سال بھر اور ہے۔"

"دیکھ منّو"۔ سدرہ بگڑ گئی۔ "میں تجھے مارے بغیر نہ رہوں گی۔ تمیز تو منحوس مارے کے پاس سے بھی نہیں گزری۔ اتنا نہیں سوچتا کہ میں تجھ سے تین چار سال بڑی ہوں۔ تم تم کرکے بات کرتا ہے۔"

"سنو!" اس نے مصطفٰے اور بازل کی طرف اشارہ کرکے چپکے سے کہا۔ "ان دونوں میں سوپرڈیلکس کوالٹی کا کون ہے سنجیدہ۔ نیلی قمیض والے یا سفید کرتے والے۔؟"

سفید کرتا بازل نے پہن رکھا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی قمیض مصطفٰے کی تھی

یسارہ اور سدرہ ہنسنے لگیں۔

"کیوں۔ کیا کرو گے تم"۔

"ان لوگوں نے مجھے ڈانٹا ڈپٹا تھا۔ انتقام لوں گا۔" منّو بولا۔

"ارے دونوں ہی ایسے ہیں جی۔" برا سا منھ بنا کر سدرہ بولی۔

"کیا انتقام لوگے تم۔ یسارہ نے پوچھا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔" منّو نے کہا۔ اور وہاں سے اٹھ کر بازل اور مصطفےٰ کے پاس جا بیٹھا۔ ان لوگوں نے اس کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ ایثار اور سعید کے ساتھ باتیں کرتے اور ہنستے رہے۔ ادھر یسارہ اور سدرہ منتظر تھیں۔ ان کی طرف مڑ کر منّو نے انھیں آنکھ سے اشارہ کیا۔ اور دفعتہً بھیانک چیخ مار کر مصطفےٰ کے بازو سے چمٹ گیا۔ وہ گھبرا گئے۔ سب ہی پریشان ہو گئے۔ منیر کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں جسم لرز رہا تھا۔ اور دانت بیٹھ گئے تھے۔

"یہ کیا ہوا۔" گھبرا کر مصطفےٰ نے اسے سنبھالا۔ اور پریشان ہو کر اسے آوازیں دینے لگے۔

"خدا خیر کرے۔" صفیہ بیگم کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ "بھری دوپہر میں منع کرتے کرتے درخت پر چڑھ گیا۔ اللہ نہ کرے کوئی سایہ جھپیٹ تو نہیں ہو گیا۔ میرے مولا بچانا میرے بچے کو۔"

بازل گھبرا کر بولے۔ "میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔ یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا۔" وہ احمد صاحب کے کمرے کی طرف بھاگے۔ احمد صاحب سراسیمہ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ یاور صاحب اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے آوازیں دینے لگے۔ سب منّو پر جھک پڑے تھے۔ مصطفےٰ نے اسے

تقریباً اپنی گود میں لٹا رکھا تھا۔ سخت گھبرائے ہوئے۔ کبھی اسے ہلاتے جلاتے۔ کبھی پکارتے۔ ان کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگا۔

"خدانخواستہ کسی زہریلے کیڑے نے تو نہیں کاٹ لیا" یاور صاحب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "مصطفےٰ اس کے کپڑے تو اتارو میاں۔ دیکھوں کہیں دانت وانت کا نشان تو نہیں ہے۔؟"

مصطفےٰ نے جلدی سے اس کی بوشرٹ اور بنیان اتار دی۔ اور ادھر ادھر ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے لگے۔

"خدایا رحم کرنا۔" آمنہ خاتون بدحواس تھیں۔ "بھابی کیا کبھی اور بھی ایسا دورہ پڑا تھا۔"

"ہائے کبھی نہیں ہوا۔" صفیہ بیگم نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ارے کسی عامل کو بلایئے۔ یہ اوپری اثر ہے۔ ڈاکٹر آکے کیا کرے گا۔ ایسے مرض ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

"وہ انجکشن دے گا۔ کچھ تو کرے گا۔" بیگم یاور نے انھیں تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی پریشان نہ ہو جاؤ۔ دعا کرو۔ اللہ جلدی اچھا کر دے۔"

"کیا ہوش آیا۔" بازل دوڑ کے پھر پاس آگئے۔ "ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔ میں نے فون پر مختصر سی کیفیت ان سے کہی تھی۔ انھوں نے کہا گھبرانے کی بات نہیں۔ لُو لگ گئی ہو گی۔"

"یہ کانپ کیوں رہا ہے۔" کسی نے کہا۔

"دانت بھی بھنچے ہوئے ہیں۔" کوئی اور بولا۔

"آنکھیں جھپک رہی ہیں۔" کسی نے کہا۔ "شاید ہوش آرہا ہے۔"

"بدن پر دیکھ لیا۔" نہایت تشویش سے مصطفےٰ نے کہا۔ "خدا شکر ہے

کہ کسی کیڑے کے کاٹنے کا کوئی نشان نہیں ہے۔"

"شاید ٹانگوں میں کہیں۔" بازل نے کہنا چاہا تھا کہ منیر نے اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے دانت پر دانت جما کر کہا: "سب کے سامنے پتلون نہ اتار دیجیے گا۔"

سب بھونچکا رہ گئے۔ منو نے مصطفےٰ کو بڑی شرارت سے آنکھ ماری اور ان کی گود سے نکل کر بھاگ گیا۔

"یہ کیا حرکت کی باجی نے۔" احمد صاحب جو بیٹے کی وجہ سے سخت مضطرب تھے۔ برافروختہ ہو گئے۔

"حد کر دی شرارت کی بدمعاش نے!" یاور صاحب بے وقوف بن جانے سے خفا تھے۔

خواتین جھینپ اور جھلاہٹ کے عالم میں منو کو اپنی زبان میں بُری بھلی سنا رہی تھیں۔

"میں تو گدھے کو پیٹے بغیر نہ رہوں گا۔" بگڑ کر بازل نے کہا۔ "میرا تو واقعی دل دھڑکنے لگا تھا کہ کہیں اسے خدانخواستہ مرگی ورگی کا دورہ تو نہیں پڑ گیا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب آتے ہوں گے۔ کیا کہا جائے گا ان سے۔"

"یہ عجب مذاق کیا بدمعاش نے۔ سچ مچ ایک دن سزا دینی چاہیے۔" احمد صاحب اطمینان سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "اتنا بھی نہ سوچا مردود نے کہ ہم سب کتنے پریشان ہوں گے۔ والدہ محترمہ کے بے جا دلاروں نے بگاڑ رہا ہے اسے۔"

"اے مجھے نہ کہیے گا۔" صفیہ بیگم جن کا فق چہرہ اب ٹھیک ہو چلا تھا۔ خفا ہو کر بولیں۔ "میں کیا دلار کرتی ہوں۔ آپ ہی نے شہ دے دے کے اسے

اتنا بدمعاش کر دیا ہے۔ بچہ ہے بچپنہ ہے۔ پھر اب بچے کی حرکتوں پر مجھے کیوں الزام دیتے ہیں۔

کسی نے کال بل بجائی۔ ساتھ ہی ملازم ڈاکٹر صاحب کی آمد کی خبر لایا۔ بانو باہر نکلے۔ انھیں ان سے معذرت کرنا پڑی۔ ہنس بھگتنا پڑی حالانکہ وہ بھی کچھ برہم تھے۔ مگر انھیں اب ہنسی آنے لگی تھی۔

منو بھاگ کے پیارا کے کمرے میں جا چھپا تھا۔ وہاں سے سب کی جھینپ جھلاہٹ اور پریشانی دیکھ کر بری طرح ہنس رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کی کھال ضرور ادھیڑ دے گا

جیسے جیسے آمنہ خاتون کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے بیگم یاور کی بیقراری ترقی پر تھی۔ مصطفےٰ کی مرضی معلوم ہونے کے بعد وہ مطمئن ہو چکی تھیں اب ان کا غذ لشنہ نہ تھا۔ مگر ایک بڑی فکر دامن گیر تھی۔ جس سے نجات ممکن نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اب تو ان کے دن کا چین حرام تھا۔ راتوں کی نیندیں اڑ چکی تھیں۔ فکر تھی اپنے بھائی صاحب جناب شرافت حسین صاحب سے ذرا بے دھی کی۔ پیارا کو دیکھنے سے قبل ان کا ارادہ تھا کہ انہی کی لڑکی لے آئیں گی۔ جانی بوجھی تو تھی ہی۔ بد سلیقہ تھی تو کیا۔ وہ اسے سلیقہ سکھا دیں گی۔ مگر اب وہ اس کے تصور سے بھی بیزار تھیں۔ پیارا اور یاسمت جہاں کا موازنہ کرتیں۔ تو انھیں اپنی عقل پر رونا آتا۔ اپنی جلد بازی پر خود کشی کرنے کا جی چاہتا۔ آخر کیوں انھوں نے مصطفےٰ کے سے

مثالی بیٹے کے لئے ریاست کا انتخاب کیا تھا۔ انھیں خوف تھا کہ عرصے سے
بھائی صاحب نے خبر نہ لی تھی۔ مگر یکبارگی لے لیں گے اور کس کے لیں گے۔۔۔
چنانچہ اس ہیجان میں ان کی صحت تباہ ہو گئی۔ سوچتی تھیں کہ بھائی کو ایک
جواب دے دیں۔ تب (احمد صاحب کو پیغام) دیں۔ ابھی اس کشمکش و پیچ میں
تھیں کہ ان کی بدترین توقعات کے مطابق ایک دن شرافت حسین صاحب
معہ بیگم اور ریاست جہاں کے ایک فیصلہ کن جواب لینے آہی گئے۔ بیگم
یاور کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انھیں ایسا لگا کہ جیسے انھیں یا تو غش آ
جائے گا۔ یا پھر قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔

شرافت حسین صاحب کی بیوی کچھ تو اپنے ہاتھی نما تن و توش کی بنیاد
پر اور کچھ اپنی دس گز کی زبان کی وجہ سے سارے خاندان میں "مثالی" مانی
جا چکی تھیں۔ انھیں اپنے چار جوان لڑکوں کا غرور تھا۔ کچھ دولت کا بھرم
تھا۔ ان کے باپ کبھی زمین دار رہے تھے۔ ہر طرح کا غلّہ دودھ گھی بلا بدتر
الخانہ دن گھر میں بھرا رہتا تھا۔ کچھ اکڑ ان باپ کی زمین داری کی بھی تھی۔
بہر حال وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اور اپنے سامنے کسی کی کچھ حقیقت
نہ سمجھتی تھیں۔

یاور صاحب ان سے بہت گھبراتے تھے۔ شرافت حسین صاحب کا
ڈیرہ ان کے گھر میں ہفتوں کا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ جس دن شرافت صاحب
معہ بیوی اور صاحبزادی کے تشریف لائے اتفاق سے یاور صاحب گھر پر
موجود تھے۔ اپنے سسرالی کنبہ کو دیکھ کر ان کا کھایا پیا بھی پانی ہو گیا۔ وہ
دم بخود رہ گئے۔

بیگم صاحبہ نے اپنی قیمتی ساڑی کا آنچل برابر کرتے ہوئے یاور صاحب

سے کہا۔ "میاں تم سے تو امید ہی نہیں کہ کبھی ہماری چوکھٹ بھی پھلانگو گے اپنوں کی مرے جیئے کی خبر لو گے۔ مگر مجھے تو تعجب ان بیوی پر ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ اب میکے کی نشانی بس ایک بھائی ہی کے دم سے باقی ہے کیا مجال کہ باپ برابر بھائی کا خیال کر کے میکے میں تو قدم رکھیں! ہم بڑے ہیں رشتہ ناطہ بڑا ہے مگر جھکتے ہم ہی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ کون سا ایسا خزانہ ہاتھ آگیا ہے کہ مزاج ہی نہیں ملتے۔؟"

"ارے سانس تو لو نیک بخت!" شرافت حسین صاحب نے نہایت فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ناف تک پھیلی ہوئی خوفناک داڑھی پر جہازی ہاتھ پھیرا اور بولے۔ "تم تو بھری بندوق ہو۔ یکبارگی ایک ایک پر چھوٹ جاتی ہو۔ کیا تم سے کسی نے کہا ہے کہ انھیں کہیں سے خزانہ ملا ہے۔ خوا مخواہ اچھے دل برے کرتی ہو۔ ارے پوچھ تو لو کہ کون سی مصروفیت تھی۔ کیا وجہ تھی کہ نہ آسکے۔ ارے کہیں آنے نہ آنے سے خون کے رشتے بھی ٹوٹتے ہیں۔؟"

بھائی صاحب!" یاور صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ اور جسم کی ساری طاقت زبان میں اکٹھی کر کے بولے۔ "آپ نہیں جانتے جب سے میں نے پنشن لی ہے۔ بیمار رہنے لگا ہوں۔ جوڑوں کے درد کی شکایت تو پہلے ہی تھی اب ڈاکٹری معاینے سے معلوم ہوا ہے کہ مجھ میں کچھ آثار شکر کی بیماری کے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں کہیں آتا جاتا نہیں۔ بس کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔ "انھیں" البتہ میں نے منع نہیں کیا۔ آپ کے ہاں آتی جاتی ہی رہتی ہیں۔"

شرافت حسین صاحب کچھ قائل ہو گئے۔ سر ہلا کر بولے۔ "ہاں میاں۔ بڑھاپا اور کہا کسے لگا ہے۔ یہ بجائے خود بیماری ہے۔ علاج کس کا کروا۔

رہے ہو؟"

"جی۔ وہی فیملی سرجن ڈاکٹر سیٹھی صاحب ہیں۔ مزاج پہچانتے ہیں کچھ افاقہ انہی کی دوا سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے سوا میں کسی اور کے پاس نہیں جاتا۔"

بیگم صاحبہ محترمہ حنیفہ بیگم نے کراری آواز میں دو ٹوک کہا۔" ارے ہاں آدمی کا کیا ٹھیک جوان دیکھتے دیکھتے موت کی ہوا میں پتنگڑ کی طرح اڑے جا رہے ہیں۔ ہمارا تمہارا کیا بھروسہ۔ کب موت کا جھکڑ چلے اور لے جا کے گورستان میں پھینک آئے۔ میں تو کہتی ہوں کہ یاور میاں کہ بھیا تم بیمار رہنے لگے ہو۔ نوج شکر کے مرض کو آگ لگے۔ بدن میں شکر آ جائے تو سمجھو کہ موت گھس گئی رگ رگ میں۔ مجھے دیکھو کہ گوشت کا پہاڑ ہوں مگر اندر سے خالی۔ بیماریوں کا گھر ہوں۔ خون کا بلڈ پریشر ناس مارا الگ ہے سر کا چکر الگ بستر پر ڈالے رکھتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ کب اللہ نہ کرے کہ چٹ پٹ ہو جاؤں۔ تو اولاد مری ماں کی قبر پر ہل چلوا دیں۔ کہ آپ تو ٹھنڈی ٹھنڈی قبر میں جا سوئیں مگر ہمارا ٹھکانا نہیں کیا۔ یہی خیال تو آج یہاں کھینچ لایا ہے کہ ہم تم مرنے سے پہلے اولاد کو گھر بار کا کر دیں۔ تم میاں بیوی نے تو سو منھ کی ناس ہی لے رکھی ہے۔ اب میں کہتی ہوں کہ ایک تاریخ مجھ سے لو اور ایک تاریخ مجھے دو۔ ایک منڈوے تلے دو نکاح بار شگونی ہے۔ جس دن اپنے لڑکے کا ولیمہ رکھو گے۔ اسی دن میں بارات لے آؤں گی۔" اپنے بڑے بڑے پان زدہ سیاہ ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی نمائش کرتی ہوئی وہ ہنسیں۔ مگر عجب تماشہ ہے ادھر چار دن لڑکے موٹے منھ پھولے بیٹھے ہیں۔ جسے چاہو داماد بنا لو۔ سب سے چھوٹا داماد آصف میں

سمجھوں۔ تمھاری لڑکی سے چھ سات سال بڑا ہے۔ کل ہی مجھ سے جھگڑا کر رہا تھا۔ کہ ببا کا نام کچھ آسمان پر نکاح میں باندھ تو نہیں گیا ہے پھوپھا حضور سے آپ نے میرے بارے میں کیوں نہ کہا۔" انھوں نے پھر قہقہہ لگایا "ارے میں نے کہا باؤلا ہوا ہے لڑکے۔ یہ کیا کچھ نیلام ہے۔ جب لڑکی پر لڑکے نام کی گالی لگ گئی، بس وہی قسمت کا جوڑ ہوتا ہے۔ ہاں میاں تو پھر کہہ دیتے۔"

شرافت حسین صاحب ننھی سی سفید رنگ کی تسبیح جیب سے نکال کر آنکھیں بند کر کے وظیفہ پڑھنے لگے۔ ان کے موٹے موٹے ہونٹوں کی خوفناک لرزش ان کی ریش دراز کی نوک تک پہونچ رہی اور اسے بھی لرزا رہی تھی۔

یاور صاحب کی بیوی کی سانس ان کے سینے میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یاور صاحب جھوں نے اپنی مفروضہ بیماریوں کا بہانہ بنا کر ان دونوں کے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبوں کو جھنجھوڑنا چاہا تھا۔ سو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ وہ محترمہ متاثر تو نہ ہوئیں۔ یاور صاحب کی موت کی پیشین گوئی کر کے انھیں نصیحت کرنے لگیں۔ یاور صاحب پر چھیا دا حاوی تھا یا غصہ۔ وہ سخت ترین صبر و سکون سے ان کی بے جوڑ بے محل بکواس سن رہے تھے۔ وہ بمشکل زبان کو تلخ ترش سے روک رہے تھے۔ یہ حکم دینے کا یارا بھی نہ تھا کہ گھر سے نکل جاؤ۔

انھوں نے اپنے بے پناہ طیش کو بدقت قابو میں کیا۔ اور بڑی رسانیت سے بولے۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ میں کچھ الجھ گیا ہوں۔" انھوں نے جو مؤثر فقرے سوچ رکھے تھے وہ گڑبڑ ہونے لگے۔

"دراصل یہ بہت پرانی بات ہے۔ اور پھر ہماری حماقت کہ۔ ہم نے۔ یا
انھوں نے۔" یاور صاحب نے اس موقعہ پر ٹھہرا کر دونوں لفظوں سے بیوی کو گھورا
تھا۔ پھر بات کا سرا پکڑا۔ "ہم نے یا انھوں نے اس سلسلے میں گفتگو کرتے
وقت اولاد کی مرضی اور پسند یا ان کی رائے ملحوظ ہی نہیں رکھی۔ چنانچہ
شرافت حسین صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ تسبیح کی گردش بھی تھم گئی
وہ مڑ کر یاور صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔ محترمہ حنیفہ بیگم بھی کچھ چونکتا
نظر آئیں۔ یاور صاحب نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "چنانچہ اب
مجھے بڑی شرمندگی کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے۔ کہ مصطفیٰ اس رشتہ پر
راضی نہیں۔ اور ـــــ!"

"کیا راضی نہیں۔" حنیفہ بیگم کے پہاڑ سے بدن میں یوں زلزلہ پڑا
جیسے آتش فشاں پہاڑ پھٹنے سے پہلے لرزنے لگا ہو۔ "جب شادی بیاہ
کی بات چلی تھی۔ تب بھی ان کے منھ سے دودھ نہیں ٹپک رہا تھا۔ انگوٹھا
نہیں چوس رہے تھے۔ ہوش عقل والے تھے۔ تب ہی کیوں نہ پھوٹ دیا۔
ہم دوسرا رشتہ تلاش کر لیتے۔ دیکھو یاور میاں یہ کمینہ پن اچھا نہیں۔ میں
کہے دیتی ہوں۔"

"کمینہ پن!" یاور صاحب کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ "یہ آپ میرے
بارے میں کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں تمہی کو۔" وہ پھٹ پڑیں۔ "زبان دے کے مکرنا۔ کمینہ پن نہیں
ہے تو اور کیا ہے؟ ہم نے بھی تو زبان دی تھی۔ ہم نہیں پھر رہے اپنی زبان
سے۔ تمہاری لڑکی کے لئے اپنے چار بیٹے تمہارے سامنے کھڑے کر
دیئے۔ جسے چاہو پسند کر لو۔ اور تم۔ تم مصطفیٰ کی آڑ میں خود کہہ رہے

ہو۔ بلاؤ لڑکے کو میں پوچھوں گی، اس سے۔ منھ چھپا کر بیٹھے رہنے سے کام نہ چلے گا۔"

"یہ تو لڑائی کا آغاز ہے۔" بیگم پادر تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ انھیں پادر صاحب کے غصّے سے ڈر لگتا تھا۔ شرافت صاحب سے بحث و تکرار کے بعد پادر صاحب کا غصّہ ان پر بھی اترتا۔ وہ اس وقت کے خیال سے کانپ رہی تھیں۔ کیونکہ اپنے بھائی کی مرضی کی صلیب پر اپنے بیٹے کو انھوں نے ہی چڑھایا تھا۔ اور بدرہ کے لئے بھی اپنے بھانجے ہی کو پسند کر بیٹھی تھیں۔ پادر صاحب کا غصّہ ان پر نکلنا تو بجا تھا۔

"شریفوں کا یہ شیوہ نہیں۔ میاں۔" شرافت صاحب نے بات برابر کرنا چاہی۔ وہ بیوی کے منھ پھٹ پنے سے ڈر ہی رہے تھے۔ کہیں معاملہ خراب نہ کر دیں۔ پادر صاحب سے انھیں امید تھی کہ اپنی لڑکی کو گھر بھر جہیز دیں گے۔ جیسا کہ تارہ کو دیا تھا۔ داماد کو مکان۔ اسکوٹر۔ کلینک کھولنے کے لئے ڈھائی لاکھ روپئے کا چیک۔ دو سو جوڑ ملبوسات۔ لڑکی کو چھ قسم کا زیور۔ اٹھاروں جوڑ کپڑے اور دوسری چیزیں ایسی کہ دیکھ کے آنکھیں کھلی رہ جائیں۔ اب بدرہ بھی وہی سب کچھ لے جاتی جہاں بھی جاتی۔ سونے کی چڑیا کو وہ ہمیشہ کے لئے قفس میں بند کر لینا چاہتی تھیں۔ یہ احساس کئے بغیر کہ ان کا لڑکا اس قابل ہی نہ تھا۔ کہ اس قدر گراں بہا جہیز کا مستحق ٹھہرتا۔ کسی لحاظ سے بھی نہیں۔ نہ صورت شکل میں نہ تعلیمی معیار سے اور نہ اخلاقی اعتبار سے۔ اس کی خوبی صرف ایک تھی۔ کہ وہ اپنا خون تھا۔ اور بس صفیہ بیگم نے مصطفےٰ پر بھی اس لئے نگاہ رکھی تھی کہ انھیں علم تھا کہ وہ ایک بڑے سرکاری

عہدیدار تھے۔ اور معقول سے زیادہ تنخواہ اٹھا رہے تھے۔ ان کی صورت و سیرت مجلّی تھی۔ شاندار آدمی تھے۔ ریاست کی سی لمبی چوڑی تنا ریست اور قد آور صاحبزادی کے لئے ایسا ہی آدمی چاہیئے تھا۔ جو مرد کی صورت ہوتا، مچھر نما نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ محترمہ جانتی تھیں کہ ان کی صاحبزادی منہ میں بارہ گز کی زبان لئے پھرتی تھیں۔ نازک دماغ ایسی تھیں کہ ان سے کسی کی ٹیڑھی نگاہ برداشت نہ ہوتی تھی۔ سلیقہ مند اتنی تھیں کہ خواب راحت سے بیدار ہونے کے بعد بستر کی شکنیں تک ان سے ٹھیک نہ کی جا سکتی تھیں۔ دسترخوان سے رکابی تک سرکائے بغیر اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ یا جھوٹی پلیٹ میں بمشکل بھر پانی سے ہاتھ دھو کر دسترخوان ہی سے ہاتھ پونچھ لیتی تھیں۔ ان کے کمرے میں صفائی کا یہ عالم تھا کہ فرش پر میلی چکٹ دری پر اکثر اچھالی ہوئی جوتی پڑی نظر آتی تھی۔ سنگھار میز کا آئینہ تیل سرخی اور کاجل کے نجیتہ دھبوں سے گل و گلزار بنا ہوا تھا۔ دیواروں پر ایک ایک انچ گرد پڑی رہتی تھی۔ کونوں میں مکڑیوں کے جالے نجانے کتنے برسوں سے جھول رہے تھے مسہری پر جو مچھر دانی پڑی تھی۔ اس کا اصلی رنگ برسوں پہلے اڑ چکا تھا۔ اب وہ بدرنگ سا ایک شامیانہ تھا جس پر گرد مستقل طور پر جم کے چپک گئی تھی۔ جگہ جگہ بالوں کے مڑے ہوئے گچھے پڑے رہتے تھے۔ اپنا کمرہ درست کرنے کا ہوش تو انہیں تھا۔ نہ والدہ صاحبہ کو خیال آتا تھا کہ پچیس سال کی پہاڑ سی عورت پر یہ پھوہڑ پن، بدتمیزی، زبان درازی اور بے ڈھنگا پن زیب نہ دیتا۔ اور یہی وجہ ان کے خوف کی تھی۔ کہ وہ کسی غیر خاندان میں پنپ نہیں سکتی۔ اس کے لئے بہترین مقام بس پھوپھی ہی کا گھر تھا۔ وہی اسے بیاہ بھی لے جاتیں،

مصطفےٰ کی ساری زندگی دکھوں اور کلفتوں کی نظر ہو جاتی۔ اس کی پروا انھیں قطعی نہ تھی۔ وہ تو بس بد زبان گستاخ اور بد سلیقہ لڑکی کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔

فی الحال ان کے سامنے دو ہی مقصد تھے۔ ریاست کا گھر بسانا اور سدرہ کو اپنے گھر لاکر اپنا گھر بھرنا۔ کڑک کر انھوں نے مطالبہ کیا۔ کہ مصطفےٰ کو بلاؤ۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ شامت۔ کچھ دیر قبل مصطفےٰ بھی گھر آچکے تھے۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھے بڑی توجہ سے باہر کی ساری گفتگو سن رہے تھے۔

"مصطفےٰ ابھی نہیں آئے"۔ یاور صاحب نے کہا۔

تبھی وہ دالان کا بڑا دروازہ کھول کر سب کے سامنے آگئے۔ شرافت حسین صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے انھیں چونک کر دیکھا۔ ریاست بھو دیر سے سامنے بیٹھی ماں باپ اور پھوپھا۔ پھوپھی کی باتیں سن رہی تھی وہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ مصطفےٰ کو مبہوت ہو کر گھورنے لگی۔ قد آور، شاندار اور سنجیدہ سفید لباس میں بڑے شاندار نظر آرہے تھے۔

مصطفےٰ نے بڑے مودبانہ انداز میں ماموں، ممانی کو سلام کیا۔ اور یاور صاحب کے پاس اس طرح بیٹھ گئے کہ ان کی پشت ریاست جہاں کی طرف ہو گئی۔ وہ غضبناک انداز میں پہلو بدل کر رہ گئی۔

"بہت دنوں بعد تشریف لائے ماموں جان"۔ مصطفےٰ نے بڑے اخلاق سے پوچھا۔

"مجھ سے بات کرو"۔ حنیفہ بیگم نے کہا۔ "اور یہ سوچ کر کرو کہ تمھاری ہاں یا نہیں پر آپس کی دوستی اور دشمنی ہو جائے گی۔ بس! انھوں نے بڑے اجلاف انداز میں ان سے پوچھا۔

"میں پوچھتی ہوں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں تھا کہ تمھارے امّاں باوا اور ہم میں ادلے بدلے کی شادیوں کی بات پکّی ہو چکی تھی"۔

"جی ہاں۔ مجھے امّی کی اس ناسمجھی پر بڑی حیرت ہوئی تھی"۔ مصطفےٰ کے جواب نے ماموں صاحب کو چراغ پا کر دیا۔ ایک جھٹکے سے اپنا رُخ موڑ کر گونجدار آواز میں بولے۔

"خیر۔ تمھاری ماں ناسمجھ بے وقوف تھی۔ مگر تم تو ہوشمند تھے۔ اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا۔ کسی کی بیٹی، بیٹے کو مانگ کر ٹھکرانا۔ اور۔ اور"۔ غصّے نے ان کی زبان بند کر دی۔

"آپ خود بھی بہتر سمجھ سکتے ہیں جناب کہ آپس کے دائمی تعلقات وہی پائیدار اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ جو فریقین کی مرضی، رائے اور پسند کو ملحوظ رکھ کر استوار کئے جاتے ہیں"۔ مصطفےٰ نے ماموں کے شدید غصّے کے جواب میں نہایت صلاحیت اور ادب سے کہا۔ "شادی بیاہ عمر بھر کا بندھن ہوتا ہے۔ جناب کسی ایک ہی فریق کی مرضی اور پسند دوسرے فریق کو اس فرض کے انجام دینے پر مجبور نہیں کر سکتی"۔

"تمھاری گہری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں"۔ حنیفہ بیگم نے آنکھیں نکالیں۔ "بس صاف صاف کہو کہ۔ ہماری بیٹی لینا اور اپنی بیٹی ہمیں دینا قبول کرتے ہو کہ نہیں؟"۔

"اب جبکہ آپ نے سدرہ کو میری بیٹی کا منصب دیا ہے۔ تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ مجھے ایسا لین دین کبھی منظور نہیں"۔ مصطفےٰ نے صاف کہہ دیا۔

مارے غصّے کے تھر تھر کانپتے اور منہ سے کف اڑاتے ہوئے حنیفہ بیگم

نے کہا۔ "پھر کہو کر قبول نہیں۔"

مصطفےٰ نے اسی مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "ایک بار پھر کہتا ہوں کر قبول نہیں۔"

"بہت اچھا۔ بہت اچھا۔" محترمہ نے دہاڑ کر کہا۔ "دیکھ لوں گی۔"

بہاں سنت پر بھوت سوار ہو گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور خاصی بھاری آواز سے بڑے طیش میں بولی۔ "سن چکیں اماں۔ جو کچھ سننا تھا۔ اب آگے بڑھو اور پاؤں پڑو ان لوگوں کے۔ منع کر رہی تھی کر ایسے غلط رشتے داروں میں مجھے مت لے چلو۔ مگر تم کو تو میری ذلت بھی کرانی تھی۔ چلو اماں۔ اب چلو یہاں سے۔ رشتے ناطے توڑ کے چلو۔ اب اگر کوئی ہاتھ پاؤں جوڑ کے بھی رشتہ دینا چاہے گا۔ تو ہم ٹھکرا دیں گے۔ ایسی کی تیسی بہت ہانکا کرتی تھیں۔ مصطفےٰ کی اماں ـــ اچھا ہوا جو آج ہی تصفیہ ہو گیا۔ مجھے کیا اس اوقات بھرے گھر میں آ کے خون تھوک کر کے مرنا تھا۔ اماں۔ کہہ رہی ہوں۔ اٹھو اور چلو۔"

شرافت حسین صاحب خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مارے صدمے کے سر جھکا کر مگر مچھ کی دمنع کا خوفناک جوتا پہننے لگے۔ اپنی طرف سے انھوں نے بات ختم کر دی۔ مگر حنیفہ بیگم چنگھاڑیں مار مار کے رونے لگیں۔ رونے پیٹنے کے دوران وہ گالیاں بھی دیتی جا رہی تھیں اور کوستی بھی جا رہی تھیں۔ بددعاؤں کا آبشار جاری تھا ان کے منہ سے۔

"جیسا میرا صبر سمیٹا ہے۔ اللہ کرے ویسا ہی کسی کا صبر تم پر بھی پڑے۔ اللہ کرے تمھارے دل کا چین بھی اسی طرح چھن جائے میرے دل میں جو آگ لگی ہے۔ ویسے ہی تمھارے کلیجے میں بھی لگ جائے۔

خدا تم سب کو غارت کر دے۔ گھر کی جگہ کنکرہ تک نہ رہے۔ میرے دل میں تم لوگوں نے چھرا گھونپا ہے۔ مظلوم کی بددعا خالی نہ جائے گی۔ ارے آج سب ماں بیٹے ایک ہو گئے۔ رشتہ ناطوں کا پاس نہیں رکھا۔ اللہ سب دیکھ رہا ہے۔" وہ دھاڑیں مار کر روئیں۔ شرافت حسین صاحب گم صم تھے۔ ریاست کھا جانے والی نظروں سے یاور صاحب، مصطفیٰ اور اپنی بھوبھی کو گھور رہی تھی۔ کچھ وہ بھی بڑبڑا رہی تھیں۔ اور ان سب کا حال یہ تھا کہ سناٹے میں آ رہ گئے تھے۔

جاتے جاتے حنیفہ بیگم نے دہلیز پر دو ہتھڑ مارا۔ اور تھوک کر چلی گئیں۔

کچھ دیر تک یہ لوگ دم بخود بیٹھے رہے۔ پھر بیگم یاور کی سسکیاں سنائی دیں۔ زار و زار رو رہی تھیں۔

"یہ کیا کر رہی ہو زہرا۔" یاور صاحب حواس باختہ تھے۔ "اپنی طبیعت خراب کرنے سے کیا فائدہ۔ تم پہلے ہی سر درد اور ہیکر اور بلڈ پریشر کی مریض ہو۔ مرض بڑھانا چاہتی ہو۔ چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے۔ دیکھو۔ اب میری طبیعت بھی بگڑنے لگی ہے۔"

"ہائے کیسے برے برے کوسنے دے گئیں بھابی جان۔" وہ اپنے پر قابو پاتی ہوئی بولیں۔ "کیا حشر ہوگا ہمارا۔ اگر لگ گئے۔ میرے پروردگار رحم کرنا میرے بچوں پر۔ میرے سر کے سائے پر!"

مصطفیٰ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس جا بیٹھے اور ان کے گرد اپنے بازو حمائل کر کے انھیں تقریباً اپنے سینے سے لگا لیا۔ "امی یہ بیکار اپنی طبیعت خراب کر رہی ہیں آپ۔ دیکھئے امی۔ ادھر ابا دل تھامے

بیٹھے ہیں۔ ادھر سدرہ بلک رہی ہے۔ اب میں بھی رونے والا ہوں میری امّی۔ اب چُپ ہو جایئے۔ آپ اپنا کیا حال کریں گی؟"

وہ سیدھی ہو بیٹھیں اور آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔ ارے آپ کیوں اثر لے رہے ہیں؟" شوہر کا فق چہرہ ان سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔ ان سب پر جو لعنتیں اور بد دعائیں برسی تھیں۔ ان کی وجہ ـــ وہی تو تھیں۔ انھوں نے مڑ کر سدرہ کو دیکھا۔ وہ تو بلک رہی تھی۔ اسے انھوں نے اپنی گود میں گرا دیا اور اس کا منھ چوم کر بولیں "بیٹی چُپ ہو جاؤ۔ تیرے آنسو میں نہیں دیکھ سکتی۔ خاموش ہو جا۔"

"اب آپ بھی اس واقعہ کو بھول جایئے امّی۔ پھر کبھی گھر میں اس واقعہ کا ذکر نہیں ہونا چاہئے" مصطفےٰ نے کچھ برہم ہو کر کہا۔ "یہ تسمہ لگا نہیں رہا۔ بہت اچھا ہوا۔ آپ کو اپنے بھائی سے تعلقات بگڑنے کا صدمہ ضرور ہو گا لیکن امّی! یہ وہ ناسور تھا۔ جو ہمارے خاندان کے جسم پر تھا۔ اس کا جسم سے الگ ہو جانا ہی اچھا ہوا۔ آپ نے اپنی بھابھی کی زبان دیکھی وہ تھوک گئیں سب پر۔ اچھا ہی ہوا جو ان محترمہ کے جوہر پہلے ہی کھل گئے اگر خدانخواستہ وہ ہمیشہ کے لئے اس گھر میں آجاتیں تو ہم سب دق میں مبتلا ہو کر مر جاتے۔ اب دفن کیجئے اس واقعہ کو اور اب ذہن کو ہر فکر و غم سے آزاد کر کے نئے رشتے استوار کرنے کی فکر کیجئے۔"

"میں نے یہی تو سوچا تھا بیٹے" نارمل ہو کر انھوں نے کہا۔ مگر ان کی آواز کمزور تھی۔ "ابھی اتوار کو آمنہ بہن جا رہی ہیں۔ آج میں نے سوچا تھا کہ کل ہفتے کو انھیں اپنے ہاں مدعو کر دوں گی۔ اور تمھارا پیغام انہی کو دوں گی۔ یشار اکا اختیار انہی کو تو ہے۔ اور۔ چار چھ دن پہلے جب میں گئی تھی

تب صفیہ باجی نے ذکر کیا تھا کہ کاش آپ کی بچی۔ اپنے ماموں زاد بھائی کو نہ مانگی گئی ہوتی۔ میں اپنے بازل سے اسے بیاہ لاتی۔ تب تو بھائی کا بھوت میرے سر پر سوار تھا۔ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ اب سوچا تھا کہ۔"

صرف سوچ ہی کے نہ رہ جاؤ۔ زہرہ۔" دیر بعد یاور صاحب نے زبان کھولی۔ "اب تمھارے راستے صاف ہو چکے ہیں۔ اطمینان سے مصطفےٰ کا پیغام آمنہ بہن کو دو۔ اور بھابھی سے صاف کہہ دو کر سدرہ کے لئے جو کچھ آپ نے سوچا ہے۔ بس۔ آپ کی مرضی۔"

"کیسا عجیب اتفاق ہے۔ مصطفےٰ ہنستے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"جو صورت حال پچھلی جگہ تھی۔ وہی یہاں بھی ہے۔"

"تو پھر۔ اب تمھارا کیا ارادہ ہے۔؟" یاور صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

"آپ بتائیے۔ کل ان سب کی دعوت اپنے ہاں کر دوں کہ۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" یاور صاحب بولے۔ "دیر نہ کرو بلکہ ابھی انھیں فون پر اطلاع دے دو کہ کل سویرے ہی سب ہمارے ہاں آجائیں۔ ناشتہ بھی یہیں آکے کریں۔"

بیوی کے چہرے پر اب رونق آئی ہنستی ہوئی بولیں۔ "ناشتہ اور دوپہر کا کھانا۔ اور رات کی دعوت۔ کتنا اچھا لگے گا۔ آپ نہیں جانتے۔ بھابی اور آمنہ بہن سے باتیں کر کے کیسا دل خوش ہوتا ہے۔ زمین کی عورتیں ہیں دونوں۔"

ان کی پہلی بات کا جواب دیتے ہوئے یاور صاحب نے کہا۔ "تم لوگوں کی غیر اہم باتیں ہی گھنٹوں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔ اہم اور ضروری

امور کے طے کرنے کے لئے ایک پورا دن چاہئیے۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ناشتے پر بھی مدعو کرلو۔ رات کے کھانے کے بعد ہم سب بیٹھ کے ایک طویل مینیو بنا لیں اور صبح بعد نماز تم اور محترمہ زیتون صاحبہ مل کر تیاریاں شروع کردو۔"

"امی! میں فون کردوں" سدرہ جو خوشی سے پھولے نہ سمارہی تھی۔ چہک کر بولی۔

"نہیں بی بی تم نہیں۔ اپنی امی کو کرنے دو" یاور صاحب نے کہا پھر کچھ دیر قبل کی ناگوار باتیں انھیں یاد آگئیں۔ یکبارگی لاحول پڑھتے ہوئے وہ اٹھ گئے۔

سدرہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب وہ ٹھیک ہوچکی تھی۔ اور کالج آنے جانے لگی تھی۔

مصطفیٰ نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتائیے۔ بازل کا موڈ اب کیسا رہتا ہے؟ وہ شادی پر خود راضی ہو گئے؟ کہ ولی الدین کے دباؤ کی وجہ سے۔؟"

"ہاں میں تو تم سے ذکر کرنا ہی بھول گئی" بیگم یاور نے جلدی سے کہا۔ "اس روز کچھ یوں ہی ذکر نکل آیا تھا۔ بازل بھی موجود تھے۔ بہت خوشمزاج دکھائی دے رہے تھے۔ کہنے لگے کہ مصطفیٰ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس طرح مجھے سمجھایا ہے کہ میں موت سے زندگی کی طرف پلٹ آیا ہوں۔ ورنہ صدمہ اٹھاتے اٹھاتے مرہی گیا ہوتا۔ کیا سمجھایا تھا تم نے انھیں؟" بیگم یاور غیر شعوری طور پر بہت مسرور اور مطمئن نظر آرہی تھیں۔ مصطفیٰ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ایک روز ان کے کالج جا پہونچے تھے۔ اور بازل کو مغموم وافسردہ بیٹھے دیکھ کر کچھ نصیحتیں کردی تھیں۔ جن کا اثر ان پر

خاطر خواہ ہوا تھا۔

"بہت اچھا لڑکا ہے۔" بیگم باور نے کہا۔ "میں تو دیکھتی ہی رہ گئی ماشاء اللہ ایسا سعادتمند، ہونہار، خوبصورت، پڑھا لکھا۔ روزگار سے لگا ہوا۔ مگر غرور تکبر نام کو نہیں۔ یونہی کہیں احمد بھائی نے کہہ دیا کہ پاؤں میں رات سے بڑا درد ہے۔ بس میاں کیا بتاؤں۔ بازل وہیں فرش پر بیٹھ گئے۔ اور باپ کے پاؤں دبانے لگے۔ ہزار احمد بھائی نے نہیں نہیں کی مگر کیا وہ مانے تھے۔ تقدیر کھل جائے گی میری بچی کی۔ اگر وہ احمد بھائی کے گھر جائے گی۔ اللہ کرادے یہ رشتہ!"

بازل کے ذکر پر مصطفےٰ کے لوح دل پر ثمارا کا دلکش سراپا ابھر آیا۔ اور ساتھ ہی ایک خلش بھی جاگ اٹھی۔ وہ جا رہی تھی پھر نجانے کب آئے گی اس کے مستقبل کی باگ ڈور اس کے ماں باپ کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اگر آمنہ خاتون اور یوسف سیٹھ اس کے رشتے پر رضامند نہیں ہوئے تو پھر۔۔۔؟ مصطفےٰ نے سن رکھا تھا کہ یوسف سیٹھ کروڑپتی تھے۔ اس کا بظاہرہ بھی مصطفےٰ کو ہو اتھا۔ ثمارا عام دنوں میں بھی۔ ہیرے کے ٹاپس پہنے رہتی تھی۔ موتیوں جڑا ہار اس کی کافوری گردن کی زینت بنا رہتا تھا۔ یاقوت کے باریک باریک نگینوں سے مرصع چوڑیاں اس کی کلائی کی خوشنمائی بڑھاتی تھیں۔ اس کا عام دنوں کا لباس ایسا ہوتا تھا جو دوسری لڑکیاں خاص خاص دعوتوں میں بھی نہیں پہن سکتی تھیں۔ تمول و امارت اس پر برستی تھی۔ مصطفےٰ بھی دولتمند ہی تھے لیکن کروڑپتی تو نہیں تھے۔ اور ظاہر تھا کہ یوسف سیٹھ اپنی نازپروردہ بیٹی کے لئے اپنی ہی ٹکر کا رشتہ ڈھونڈھیں گے۔ تب۔ تب کیا ہوگا؟

ان کا دل دھڑکنے لگا۔ اور پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

ان کی آنکھوں تلے بازل کا معصوم چہرہ پھر گیا۔ شاید وہی حشر میرا بھی ہوگا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی مسرت غموں کے اندھیروں میں کھونے لگی۔ پھر وہ خود ہی دل کو بہلانے کے لئے سوچنے لگے۔

قبل از مرگ واویلا کیسی؟ ہو سکتا ہے کہ یوسف سیٹھ کے خیالات اتنے سطحی نہ ہوں۔ انسان کے لئے صرف دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اور دل کے معاملات میں تو حکومتیں اور بادشاہت بھی حارج نہیں ہو سکتی ہیں۔

دوسرے دن ان کے ہاں جشن کا منظر تھا۔ بیگم یاور نے رات ہی کو احمد صاحب کے ہاں فون کر دیا تھا۔ انھیں ناشتہ، لنچ اور ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ بڑی خوشی سے احمد صاحب کی بیوی نے دعوت قبول کر لی اور مذاق میں کہا تھا۔

"ناشتہ پر کیوں آئیں۔ ابھی کیوں نہ آجائیں۔ ہم لوگ بعد نماز فجر ہی ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔ اتنے سویرے کیسے آسکیں گے؟"

"بھابی تو پھر ابھی آ جاؤ! میں منتظر ہوں!" بیگم یاور بولیں۔ "جتنی دیر ساتھ رہیں۔ اتنا ہی اچھا ہے۔ آمنہ بہن جانے والی ہیں۔ اور بس۔ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔"

"انشاء اللہ کل جی بھر کے باتیں کریں گے۔" صفیہ بیگم نے کہا۔ "میں تو سچ مچ آجاتی۔ مگر آمنہ شیبا کو لے کر شاپنگ کرنے گئیں ہیں۔ پرسوں ان کی روانگی ہے نا۔ جانے کیا کچھ خریداری کر رہی ہیں۔ ارے ہاں۔ بھابی ایک اہم ترین بات تو میں تم سے کہنا ہی بھول گئی۔ دوپہر کو ٹیلیگرام آیا تھا

یوسف بھائی آج رات کو کسی وقت آنے والے ہیں۔"

"ارے بھابی بے حد خوشی کی بات ہے۔" بیگم یاور نے کہا۔ "آمنہ بہن سے کہیے کہ ہمارا تعارف کرادیں اور صبح انھیں اپنے ساتھ ضرور ضرور لائیے۔"

"ہاں!" احمد صاحب کی بیوی نے کہا۔ "ضرور لاؤں گی۔ اچھا اب چلوں ــــــ؟"

"خدا حافظ۔"

انھوں نے بھی فون رکھ دیا۔ اور یہ خوشخبری مصطفیٰ اور یاور صاحب کو سنائی۔ یاور صاحب نے رسمی گرمجوشی کا اظہار کیا تھا۔ مگر مصطفیٰ کے بدترین اندیشے ابھی سے حقیقت کا بھیانک روپ دھار کر انھیں ڈرانے لگے۔ کس لئے آرہے تھے یوسف سیٹھ۔ وہ ساری رات عجیب سے کرب و اضطراب میں گزار کر صبح کو اپنے باغ میں نکلے تب ان کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ سر میں درد، اعضا شکنی، دماغ بیمار ہو رہا تھا۔ اور اس کا اثر جسم پر بھی پڑنے لگا تھا۔

دفعتاً انھوں نے پچھلے کمپاؤنڈ میں کاروں کے رکنے کی آوازیں سنیں اور ساتھ ہی برآمدے سے سدرہ چیخنے لگی۔ "بھائی جان وہ لوگ آ گئے۔ آپ جلدی سے آئیے۔ ابا بلا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔

مصطفیٰ تیار ہو کر بڑے ہال میں آئے تو سب سے پہلے ان کی نظر یوسف سیٹھ ہی پر پڑی۔ جس قدر دولتمندوں کو ظاہری طور پر ہونا چاہئے تھا۔ وہ ویسے ہی تھے۔ مرعوب کن، باوقار، سنجیدہ اور محتاط سے۔ غالباً ان سب کا تعارف ہو چکا تھا۔ مصطفیٰ کا تعارف باذل نے کرایا۔ اور

انھوں نے بڑے انکسار سے جھک کر سلام کیا۔ اور مصافحہ کے لئے سیٹھ صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

طعام خانے کی طرف جاتے ہوئے مصطفےٰ کی نگاہ ایک خاتون کی جانب اٹھ گئی۔ اور ایک کپکپی سی ان کے جسم میں دوڑ گئی سفید ساری اور لمبی کلائیوں بند کرتے میں ملبوس تھیں۔ آنچل سر پر تھا۔ لیکن آدھا چہرہ جو نمایاں تھا وہ سیاہ اور جلا ہوا تھا۔ جیسے چہرے کے آدھے رخ پر کسی نے جان بوجھ کر تیزاب ڈال دیا ہو۔ ایک آنکھ بھی جل چکی تھی۔! گوشت سکڑ کر ایک جگہ سمٹ کے آنکھ کے حلقے میں دھنس گیا تھا۔ پیشانی پر کا کچھ حصہ بھی جلنے سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ لیکن جلے ہوئے چہرے کے وہ ہونٹ وہ ہونٹ جن کے لئے اچھے اچھے شاعروں کو کسی اچھوتی تشبیہہ کی تلاش ہوتی۔ کتنے خوشنما لب تھے جیسے اس بدنما اور ڈراؤنے چہرے پر الگ سے بنا کے کسی نے چپکائے ہوں۔ ورقی سرخ اور بے حد خوبصورت ہونٹ تھے۔ خاتون کی عمر چالیس سے زیادہ نہ رہی ہو گی۔ جسم سڈول تھا۔ سراپا پُر کشش مگر جسے چہرے کی بدنمائی نے کسی قابل نہ رکھا تھا۔ وہ بیچاری اپنا آدھا چہرہ ساری کے آنچل سے چھپائے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر تک وہ سب کے ساتھ کھڑی رہیں۔ پھر چپکے سے کچھ آمنہ خاتون سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔ وہ انھیں لئے ہوئے سدرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کا تعارف کسی نے نہیں کرایا۔ اور وہ وہاں سے چلی گئیں۔ تب مصطفےٰ کے ذہن سے بھی محو ہو گئیں۔

بیگم یاور نے بڑا پر تکلف ناشتہ تیار کروایا تھا۔ طعام خانے کی لمبی

میز انواع و اقسام کے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ جہاں مختلف قسم کے جوس کے ساتھ ساتھ قیمہ۔ آملیٹ اور پراٹھے بھی تھے۔ میز پر ناشتے کے ساتھ ساتھ باتیں شروع ہو گئیں۔ سیٹھ صاحب مہمان خصوصی تھے۔

"آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا جناب!" یاور صاحب نے کہا۔ احمد بھائی سے آپ کے ذکر سن سن کر آپ سے اسقدر شناسائی ہو گئی ہے کہ اب اجنبیت کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ لیکن آپ یہاں کچھ عرصے قیام کی غرض سے تشریف لائے ہوتے تو زیادہ خوشی ہوتی۔ اب تو یہ ہوگا کہ۔ رو ئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد!"

سیٹھ صاحب کی آواز بہت بھاری تھی۔ اتنی ہی سنجیدہ بھی۔ ابلا ہوا انڈہ فورک سے اٹھاتے ہوئے بولے۔ "عجیب سنیچر پاؤں میں بندھا ہے بھائی صاحب۔ بہت سوچتا ہوں کہ آخر کہیں کسی جگہ تو کچھ دیر قیام کروں۔ مگر کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر آب و دانہ کہیں اور لے جاتا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ آپ کے حیدرآباد کی سیر میرے پروگرام میں شامل ہی نہ تھی۔ نہ یہ گمان تھا کہ آپ حضرات سے شرف نیاز حاصل ہوگا۔ مگر دیکھئے کہ پہونچ گیا ہوں یہاں ——!"

"چچا جان!" دفعتہً سدرہ بول پڑی۔ "آپ ہم سب سے ملنے —— نہیں آئے۔ آپ پپا ماں کو ساتھ لے جانے کے لئے آئے ہیں۔"

"اسے بھی اور بیٹی تمھیں بھی" سیٹھ صاحب خفیف سا مسکرائے۔

"مجھے بھی" سدرہ جوش مسرت میں کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اور انھیں اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر پھر بیٹھ گئی۔ "تو پھر چچا جان میں اپنا

سامان درست کرلوں۔ چچا جان۔ میں بشارا کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ مجھے اپنے ساتھ ضرور لے چلئے۔

"ہاں بیٹی! ضرور لے چلوں گا۔ مگر اس میں دیر لگے گی" سیٹھ صاحب بولے "مگر آپ تو پرسوں جا رہے ہیں" سدرہ کا منھ لٹک گیا۔

"تو کیا بیٹی۔ تم جانا میرے ساتھ۔ مگر تم اپنا سامان درست نہ کرو" انھوں نے گلاس تھامتے ہوئے کہا۔ "جو سامان تمھارے ساتھ جائے گا۔ وہ انشاء اللہ دوسری طرح کا ہوگا۔"

سدرہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ ایک ایک کا منھ دیکھ کر پھر پلیٹ پر جھک گئی۔

بڑوں میں کافی اور چائے کا دور ہو رہا تھا۔ مگر سدرہ اور بشارا ناشتہ ختم کر کے جلدی اٹھ گئیں۔ موسم بہت دلکش ہو رہا تھا۔ برآمدہ موگرے کی مہک سے طبلۂ عطار بنا ہوا تھا۔ آفتاب کی نرم چمکدار کرنیں اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں کا منھ چومنے لگی تھیں۔ دونوں جا کر برآمدے میں بیٹھ گئیں۔

"رات میں چچی جان کے ساتھ شوپنگ کرنے گئی تھی" بشارا بولی۔ "تمھارے لئے یہ ہار لائی ہوں۔ اگر میری نشانی کے طور پر رکھ تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ سدرہ تم سے دور جانے کا مجھے بہت احساس ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیا کروں۔ اب تو چچا جان بھی آ گئے ہیں۔ ان کے سامنے انکار کی ہمت نہیں۔ جانا ہی پڑے گا۔" اس کی خوشنما آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ پھر اس نے اپنے چھوٹے سے پرس سے ایک خوبصورت طلائی ہار نکالا اور سدرہ کو پیش کر دیا۔ گلوگیر آواز میں بولی

"رکھ لو ایک دور افتادہ بہن کا نذرانۂ محبت سمجھ کے۔"
ہار آنکھوں سے لگا کر سدرہ پڑی۔ "ہائے کاش ہم نہ ملے ہوتے"
"قسمت نے ملایا تھا۔ جدا کرنے کے لئے۔" یشارا کے آنسو اس کے
رخساروں پر بہہ نکلے۔ "سدرہ خط لکھتی رہنا۔ میں۔ اپنا دل۔ تمھارے
گھر میں چھوڑے جا رہی ہوں۔"
"یہ کہنے کی بات نہیں میری یشارا۔ میں روز تمھیں خط لکھا کروں گی۔"
"سدرہ! ایک بات کہوں۔"
"ہزار باتیں کہو یشارا۔ پھر تمھاری باتیں کہاں سننے کو ملیں گی۔"
"سدرہ! سدرہ! تم مصطفےٰ صاحب سے بھی میری طرف سے التجا
کرنا۔ کہ کبھی میری یاد آئے تو مجھے چار سطریں لکھ دیں۔" یشارا کے لب کانپ
رہے تھے بھیگی پلکیں جھپک رہی تھیں۔ اس کی اس کیفیت سے متاثر
ہونے کے بجائے سدرہ نے مسکرا کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور
اور اس کے گال پر اپنے لب رکھ کر گنگنائی۔ "جانتی ہوں خوبصورت پری تم
اپنا دل میرے گھر میں نہیں چھوڑے جا رہی ہو۔ بھائی جان کے کمرے
میں رکھ کے بھول گئی ہو۔ مگر کچھ نسبت کی خبر بھی ہے۔ اب امّی تمھیں
چچی اماں سے مانگ رہی ہیں ہمیشہ کے لئے۔ کہا نہیں کسی نے تم سے۔
اب اسی لئے تو دن بھر کے واسطے سب کو بلایا ہے۔ کہ بھائی جان کا
پیغام دیں۔ اب تم اللہ کرے ہمارے ہاں آ ہی رہی ہو۔ تو میں تمھارا
پیغام بھائی جان کو کیوں پہونچاؤں۔"
"نجانے کیا کہہ رہی ہو۔" یشارا کا حسین چہرہ رنگین ہو گیا۔
"بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ ادھر معاملات کی باتیں شروع بھی ہو چکی

ہوں گی۔" سدرہ بولی۔

"یسارا جو معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ اس نے محجوب ہو کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "اے اللہ میرے کیا تو نے سچ مچ میری دعائیں سن لیں۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

وہ سب ناشتے کے بعد بڑے ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے تھے۔ ملازموں نے چاروں پنکھے آن کر دیئے۔ اور باغ کی طرف کھلنے والے دریچوں کے پٹ کھول کر پردے ایک طرف سمیٹ دیئے۔

یوسف سیٹھ نے اپنا سگار سلگایا۔ اور یاور صاحب نے سگریٹ جلا لیا۔ خواتین ایک طرف پاندان لے کر بیٹھ گئیں۔ مصطفےٰ اور بازل بھی موجود تھے۔ مگر دور ہٹ کے بیٹھے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ مگر ان کی ساری توجہ ان حضرات کی باتوں ہی کی طرف تھی۔

سیٹھ صاحب اور احمد صاحب تو ہمیشہ کی طرح روایتی انداز میں رسمی سی باتیں کرنے لگے تھے۔ مگر مصطفےٰ کی توجہ احمد صاحب کی طرف تھی۔ جن کے زرد تھے چہرے پر عجیب سی بے چارگی۔ بے بسی اور مظلومیت طاری تھی۔ وہ مضطرب بھی نظر آ رہے تھے۔ رہ رہ کر وہ اپنے چہرے پر پھوٹ آنے والے پسینے کو رومال سے صاف کرنے لگتے۔ ان پر مصطفےٰ ہی کی نظریں نہیں پڑ رہی تھیں۔ ان کی طرف بیگم احمد بھی دیکھ لیتی تھیں۔ مصطفےٰ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اس کیفیت کی وجہ کیا تھی۔ انھوں نے بازل کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی۔ انھوں نے ایک دکھی سی سانس لے کر کہا۔

"میں تو بہت عرصے سے ابا کو اس عالم میں دیکھ رہا ہوں۔ ہمیشہ فکرمند

پریشان اور اداس رہتے ہیں۔ میں ہزار پوچھتا ہوں کونسی ایسی بات ان کی افسردگی اور بیقراری کی ایسی ہے جو وہ مجھے نہیں بتا سکتے۔ مگر۔ بس۔ ٹال دیتے ہیں۔ کبھی اختلاج کا بہانہ بنا دیتے ہیں۔ کبھی اعصابی کمزوری کا۔ مگر کیا میں سمجھ نہیں سکتا کہ ان کے اضطراب کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ جو وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتے"۔

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ بیارا کو بے حد چاہتے ہیں"۔ مصطفےٰ نے جھجکتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔ "ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے مگر بامروت اور روادار آدمی ہیں۔ کہہ نہیں سکتے بھائی کا دل توڑ نہیں سکتے۔ اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" دفعتہ وہ لوگ خاموش ہو کر سیٹھ صاحب کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور یکبارگی کچھ متحیر سے ہو کر رہ گئے۔

"بس میں تو یہی چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے کم سے کم ایک تقریب تو میرے سامنے ہو جائے۔ یادر بھائی آپ یقین کریں کہ نہ کریں۔ مگر مجھے بجز اچھے لینا دینا نہیں ہے۔ اس مذموم رسم کا میں قائل ہی نہیں آپ براہ کرم مان لیجئے میری التجا۔ پھر میں معلوم نہیں کہ کب آؤں۔ آبھی سکوں یا چلا جاؤں یورپ یا امریکہ کے کسی بزنس ٹور پر۔ لہذا میں ہفتہ بھر اور رک جاتا ہوں۔ آپ جلد سارا انتظام کر لیں ـــــ جمعہ کی سہ پہر کو بازل کی بارات لے آؤں۔ شام تک آپ رخصتی کر دیجئے۔ اور انشاءاللہ اتوار کو بازل اور سدرہ میرے ساتھ چلیں علیگڈھ۔ میں نے سدرہ سے وعدہ بھی کیا ہے۔ کہ اسے اپنے ساتھ لے چلوں گا"۔

ہم۔ مگر۔ افراط مسرت سے بے خود ہو کر اور اپنی مسرت کو بہت کچھ چھپا کر بیگم یادر نے کہا۔ "یوسف بھائی آپ تو سچ مچ گڑیا گڈے کا بیاہ

کرنا چاہتے ہیں۔ کیا چار دن میں یہ بات ممکن ہے؟"

"نہیں تم چار دن کی بات کرتی ہو بیگم۔" سیٹھ صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے اجازت دو تو میں ایک گھنٹے میں یہ بات ممکن کر کے دکھا دوں۔ ہے اجازت۔" اب بیگم پادر سے ضبط نہ ہوا۔ بے ساختہ ہنس کر بولیں۔ "میری اجازت چاہتے ہیں۔ کیا سدرہ آپ کی بچی نہیں ہے؟"

"تو پھر طے ہو چکا لے آئیں گے جمعہ کو بارات۔" سیٹھ صاحب کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ پادر صاحب نے ایک بار بھی کچھ نہ کہا۔ مصطفےٰ حیران تھے اور بازل بھونچکا۔ خواتین کے مسرور چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ پھر پادر صاحب کی بیگم نے سیٹھ صاحب سے کہا۔ "یوسف بھائی آپ نے میرے آنچل میں ایک ہیرہ ڈال دیا۔ مگر ابھی یہ آنچل آپ کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ اپنا دوسرا ہیرا بھی اسی آنچل میں ڈال دیجئے۔ آپ نے اتنے عرصے میں مصطفےٰ کو دیکھ لیا ہے۔ یقین کیجئے کہ میں ثیارا کو کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔"

مصطفےٰ کا دل دھڑک اٹھا۔ سارا جسم ایک کان بن کر سیٹھ صاحب کے فیصلے کا منتظر ہو گیا۔ مگر ابھی سیٹھ صاحب کچھ کہہ نہ سکے تھے کہ دفعتہً تمد صاحب بول اٹھے۔ "نہیں! نہیں! ابھی ثیارا کے لئے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔" ان کی آواز میں عجیب سی کرختگی تھی۔ اور ان کی آنکھوں سے ایک بیزاری ایک وحشت عیاں تھی۔ سب کی نظریں ان کی طرف تھیں۔ سب پر خاموشی اور حیرانی طاری تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا۔ احمد صاحب کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اور وہ بے جان سے ہو کر کرسی پر گر پڑے۔ ان کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا۔ اور سارا جسم پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اور چہرے پر زردی پھیری ہوئی تھی۔

مرد بد حواس تھے عورتیں رونے لگی تھیں۔ احمد صاحب کی بیوی ان پر جھکی انھیں آوازیں دے رہی تھیں۔ ان کی چیخیں سدرہ اور پیارا کو بھی اس طرف کھینچ لائیں۔

ماحول اچانک غمناک ہو چکا تھا۔ پیارا بھی باپ کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ سیٹھ صاحب اور بادر صاحب نے احمد صاحب کو اٹھایا۔ اور بڑے دیوان پر لٹا دیا۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔

"ہائے یہ کیا ہوا۔ میں شروع ہی سے سمجھتی تھی کہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔" بیگم احمد شوہر کے پاس بیٹھی بلک رہی تھیں۔ منو سہما ہوا بیٹھا تھا۔ سدرہ پیارا کو پکڑے خود بھی رو رہی تھی۔ مصطفےٰ پاس کھڑے حیرت اور افسوس سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ ان کی حالت عجیب تھی۔ ایک تو ان کے دل پر احمد صاحب کے غیر متوقع اور پر زور انکار نے یونہی زخم لگا دیا تھا۔ اور اب یہ کیا ہو گیا تھا۔؟ اتنے میں بازل ڈاکٹر کو لئے اندر آ گئے۔ وہ فوراً ہی ڈاکٹر کو بلانے چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے سب کو ہٹا کر ان کا چیک اپ شروع کر دیا۔ خواتین کو ایک ہاتھ اٹھا کر منع کیا کہ وہ اس طرح سوز و فغاں نہ کریں۔ اب وہ الگ کھڑی بسک رہی تھیں۔ بیگم احمد نے گھٹی ہوئی آواز میں آمنہ خاتون سے کہا۔

"ہمیشہ اسی بات کا ڈر لگا رہتا تھا مجھے۔ آج وہی ہو گیا۔ وہ راز آخر ان کی جان لے کر ہی رہیگا۔ اللہ رحم کرے مجھ پر اور بچوں پر۔"

"احمد بھائی کو شروع ہی سے وہ بات سب سے کہہ دینا چاہیئے تھی۔" آمنہ خاتون نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "آخر ڈر خوف کس کا تھا۔"

"ہوش آ رہا ہے شاید۔" احمد صاحب کو پلکیں جھپکاتے دیکھ کر بازل نے

انھیں آوازیں دینی شروع کر دیں۔ احمد صاحب نے بالآخر آنکھیں کھول دیں۔

"ابا۔ کیا ہوا آپ کو۔؟" بازل نے ان پر جھک کر کہا۔ "ابا کچھ کہئے۔ اب آپ خود کو کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"بھائی جان۔ آخر یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے؟" سیٹھ صاحب نے بھی ان پر جھک کر کہا۔ "ذرا تو دل قابو میں کیجئے۔ ایسا بھی کیا۔ اب کیسے ہیں آپ؟"

"کچھ لاؤں۔ پیجئے گا۔" بیگم احمد نے ان کی پیشانی پر اپنا برف سا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ابا ___ میرے ابا۔" پُشپا دا بھی ان سے چمٹ گئی "میرے ابا۔ کیوں بیہوش ہو گئے آپ۔ ابا میں آپ پر سے قربان ہو جاؤں گی میرے ابا۔ آنکھیں کھولئے۔ مجھے دیکھئے۔ باتیں کیجئے مجھ سے۔ ابا۔ آپ کہیں گئے تو میں نہیں جاؤں گی۔ میرے ابا۔ میرے ابا۔" وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر بلک اٹھی ___ "نہیں بیٹی ایسا نہیں کہتے" یاور صاحب نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا دیا۔

"ابا۔ دودھ لاؤں۔" بازل نے اپنے ہاتھوں میں ان کا چہرہ دبا لیا۔

"ابا۔ مجھے پکاریئے۔" منور رو کر بولا۔

"اب کیا کیفیت ہے جناب۔" ڈاکٹر نے احمد صاحب سے پوچھا۔ "بتائیے ہمیں" ___ "کچھ نہیں۔ کمزوری سی ہے۔ سر میں چکر ہے۔ اور۔ اور تو کچھ نہیں۔" پست آواز میں احمد صاحب نے کہا۔

ڈاکٹر صاحب اٹھے۔ اور سیٹھ صاحب کو الگ لے گئے۔ بازل ان کے ساتھ تھے۔ "آخر کیا ہوا ہے ابا کو ڈاکٹر صاحب۔؟"

"ہلکا سا دورہ دل کا پڑا ہے خطرہ کی بات نہیں ہے کوئی۔"

"مگر یہ ہوا کیونکر انھیں؟" سیٹھ صاحب نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ احمد صاحب کے دل پر کوئی بوجھ ہے۔ وہ عرصے سے شدید ڈپریشن کا شکار تھے ہی۔ میں نے بارہا پوچھا کہ آخر کیا بات ہے۔ آپ اتنے بجھے بجھے سے کیوں رہتے ہیں۔ کیا غم ہے آخر آپ کو کس بات کی کمی ہے۔ کہتے کچھ نہیں۔ بس میری فطرت ہی ایسی ہے۔ لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ضرور ان کے دل پر کچھ بوجھ ہے۔ وقتی تدبیر تو دواؤں سے ہو جائے گی۔ مگر آپ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ ان سے ان کی فکریں ان کا بوجھ دور کیجئے۔ فی الحال تو سخت آرام اور سکون کی ضرورت ہو گی انھیں۔"

پھر انھوں نے ایک نسخہ بازل کو تھما دیا۔ "آپ یہ دوائیں منگوا لیں کل صبح ان کا اسی۔ سی۔ جی ٹیسٹ بھی کرنا ہو گا۔ وہ میں مشین لا کر گھر پر کر دوں گا۔ لیکن میں نے جو مشورہ دیا ہے اس پر عمل ضرور کریئے گا۔"

کچھ دیر بعد احمد صاحب اس قابل ہو گئے کہ اٹھ کر بیٹھ سکیں۔ انھیں دوائیں کھلائی گئیں۔ موسمی کا رس پلایا گیا۔ آہستہ آہستہ ان کی قوت عود کر آئی۔ اور سب نے اطمینان کی سانس لی۔

دوسرے دن کا سورج طلوع ہوا تھا۔ تو احمد صاحب کافی بہتر معلوم ہوئے۔ صبح ہی ڈاکٹر نے آ کر ان کا۔ اسی۔ سی۔ جی کیا۔ دل کی حالت زیادہ خراب نہ تھی۔ دورہ معمولی سا پڑا تھا۔

"خدا کا شکر ہے آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس اب آرام کرنا ہو گا آپ کو

اور خوش رہنا ہوگا۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب رخصت ہو گئے۔ اب سب کے سب احمد صاحب کو گھیرے بیٹھے تھے۔ ان میں یاور صاحب۔ بیگم یاور، مصطفیٰ اور سدرہ بھی تھی۔ وہ رات کو واپس نہ گئے تھے۔

آخر بات سیٹھ صاحب نے ہی چھیڑی۔ "بھائی صاحب کل آپ کو دورہ پڑنے سے پہلے یاد ہے ہم نے بازل کی بارات جمعہ کو لے جانے کا وعدہ یاور صاحب سے کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم وہ وعدہ اب بھی پورا کریں۔ اس طرح آپ کا دل بھی بہلے گا۔ بازل کا سہرا دیکھنے کا سبھی کو ارمان تھا۔ اور پھر میں ہوں۔ سارا انتظام کر لوں گا۔ کیوں؟"

سدرہ یہ سن کر چپکے سے وہاں سے چلی گئی۔ مگر بازل وہیں بیٹھے رہے "بھئی نیک کام میں دیر کرنے کا قائل میں بھی نہیں ہوں۔" یاور صاحب نے کہا۔ "مگر اس طرح احمد صاحب —— میرا مطلب ہے۔ ان کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے۔؟"

"نہیں نہیں۔ یاور بھائی۔ بارات جمعہ کو آئے گی۔ آپ لوگ بھی اب جائیے آرام کریئے اور سارے انتظام کیجئے۔ اور میں تو اب ڈر گیا ہوں۔ خدا جانے کب دوسرا دورہ پڑ جائے۔ کم از کم بازل کی خوشی تو دیکھ لوں۔"

"اے خدا نہ کرے آپ ایسی باتیں کیوں کیا کرتے ہیں۔" بیگم احمد بولیں۔ "سنا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کیا کہا ہے۔ خوش رہا کریئے۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ یہ تو اتفاق تھا۔"

آخر یاور صاحب وغیرہ رخصت ہوئے۔ اور پھر وہ سب سدرہ کی شادی کے انتظام میں لگ گئے۔ احمد صاحب کے انکار کا ذکر پھر کسی نے نہ چھیڑا البتہ اسکا خیال ان سب پر ایک منحوس سائے کی طرح منڈلا رہا تھا۔

موسم گرما کی ایک ویران سی رات تھی ۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں ۔ چاند کہیں آدھی رات کے بعد بادلوں کے غبار سے اپنا زرد چہرہ نکالتا اور پھر کہیں گم ہو جاتا ۔ تاروں کا غبار گھنا اور چمکیلا تھا ۔ چھوٹے سے پائیں باغ میں مونگرا اور جنگلی گلاب کثرت سے پھولے تھے ۔ جن کی ملی جلی خوشبو برآمدے میں چکراتی پھر رہی تھی ۔ رات کے ڈھائی تین بجے تھے ۔ پچھلا دن عجیب ہنگامہ خیز تھا ۔ جب وعدہ یوسف سیٹھ بازل کی بارات لے آئے تھے ۔ ہفتہ بھر سدرہ کی "ایمرجنسی شادی" کی تیاریوں میں گزر گیا تھا ۔ بھاگم بھاگ اس کے لئے زیورات خریدے گئے ۔ دوسرا ضروری سامان تیار کیا گیا ۔ صبح سویرے ہی سیٹھ صاحب نے سوٹ کیسوں میں بند کر کے بری کا سامان یاور صاحب کے ہاں بھجوا دیا تھا ۔ انھوں نے بیگم یاور سے تو کہہ دیا تھا کہ دھوم دھام نہ کریں مگر انھوں نے الو لعزمی کی انتہا کر دی ۔ بڑے قیمتی ملبوسات، بڑے بیش قیمت زیورات تھے ۔ جو سدرہ کے لئے بھجوائے گئے تھے ۔ پھر یاور صاحب کے ہاں جہیز کے سجانے سنوارنے، کوٹھی پر روشنی کرنے اور مہمانوں کو بروقت مدعو کرنے اور ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کو دعوت کا آرڈر دینے میں سارا دن گزر گیا ۔ سدرہ کی سہیلیاں اکٹھا تھیں ۔ سدرہ کتنی عمدہ تقدیر لائی تھی ۔ ثنا دادا کی بھابی بن کر جا رہی تھی ۔ بازل کے سے آدمی کی دلہن بن کر ۔ سدرہ کو تو یہ سب خواب لگ رہا تھا ۔ وہ بازل کی شریک زندگی بن گئی، اور بہت کچھ اودھوم نکلے کر رات کے ایک بجے میکے سے سسرال سدھار گئی ۔

دوسرے دن ولیمہ ہونا تھا۔ لہٰذا بازل کے اصرار پر مصطفٰیؔ خود بھی احمد صاحب کے گھر آگئے تھے۔ سیٹھ صاحب بے حد تھکے ہوئے تھے۔ اور بازل اپنی دلہن کے ساتھ شب آفریں کے حسین لمحات کو ہمیشہ کے لئے اپنے دلوں میں سمار ہے تھے۔ مصطفٰیؔ خود بے حد تھکے تھے۔ مگر ان کے دل پر کچھ ایسا اثر تھا کہ نہ تو انھیں تھکن کا احساس تھا نہ کسی اور بات کا۔ جب ارمان ہی ختم ہو گئے تھے تو پھر جان کی کسے پروا تھی۔ انھوں نے ایک مشین کی طرح یہ پانچ دن گزارے تھے۔ سدرہ کی شادی کے انتظامات کرتے رہے۔ اور جب وہ بدا ہو کر جارہی تھی۔ تو ان کی آنکھوں سے جو ساون بہا تھا۔ وہ اپنی بہن کی جدائی کے غم ہی میں نہیں۔ خود اپنی اجڑی ہوئی زندگی کے جشن میں بھی بہا تھا۔ پھر مصطفٰیؔ بازل کے اصرار پر انھیں کے گھر آگئے تھے۔

رات چونکہ زیادہ جا چکی تھی۔ اور احمد صاحب کی تیمارداری کا فرض انہی پر آپڑا تھا۔ چنانچہ مصطفٰیؔ احمد صاحب کے گھر رہ گئے تھے۔ انھیں دوا کھلائی تھی۔ کچھ دیر ان سے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر ان سے اجازت لے کر اٹھے تھے۔ تب احمد صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور گھگھیا کر کہا تھا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے بچے۔" اگر نہ کہوں گا تو سچ مانو کہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تم بہت اچھے لڑکے ہو مجھے بے حد پسند ہو۔ لیکن میں مجبور رہوں بیٹے۔ ورنہ انکار نہ کرتا۔"

"آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ اور یوں بھی آپ کے لئے یہ باتیں اچھی نہیں ہیں۔ آپ کوئی فکر نہ کریں جناب۔" اور مصطفٰیؔ نے انھیں رات کی آخری خوراک دوا کی پلادی۔ احمد صاحب اب مضمحل اور کمزور لگ رہے تھے۔ وہ کروٹیں بدلتے رہے اور رات آہستہ آہستہ

گزرتی رہی۔ آخر کار وہ سو گئے۔ اور مصطفےٰ تھکے ہارے سے اٹھے اور باغ میں آکر ایک سنگی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی۔ اور دل پر ایک ناقابل برداشت بوجھ تھا۔

انھیں امید تھی کہ ان کا پیغام احمد صاحب قبول کرلیں گے۔ اگر انکار کا ڈر تھا تو سیٹھ صاحب کی طرف سے۔ مگر انکار احمد صاحب نے کر دیا تھا۔

آخر کیوں ہے۔

کیا کمی تھی مجھ میں ہے۔

لڑکی والے میرے ہاتھ کے لئے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔

پھر آخر یہ انکار کیوں ہ

ان کے جیسے شوہر کا خواب تو ہر لڑکی دیکھتی ہے۔

اچانک انھیں وہ باتیں یاد آگئیں۔ جو اتفاق سے اس دن انھوں نے سن لی تھیں۔

وہ سرگوشیاں جو احمد صاحب کو دورہ پڑنے کے بعد بیگم احمد اور آمنہ خاتون میں ہوئی تھیں۔

بیگم احمد نے کہا تھا کہ کوئی راز ہے جو احمد صاحب کی جان لینے پر تلا ہوا ہے۔ کیا مطلب تھا اس کا ہ۔ کون سا راز ــــ اور کیسا راز ۔ہ

اور کہیں یہ راز ثنار اسے متعلق تو نہیں تھا۔ کیا اسی وجہ سے احمد صاحب نے دہشت زدہ ہو کر انکار کیا تھا۔ اور اس کے بعد ان کے دل پر دورہ پڑ گیا تھا۔ ہ

دفعتہً وہ سیدھے ہو بیٹھے۔ ایک سفید سایہ روش پر چلتا ہوا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اور دور سے آنے والی روشنیوں کے انعکاس میں جب وہ سایہ نمایاں ہوا تو مصطفیٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"آپ ؟" ان کے لب کھل گئے۔ پیارا ان کے قریب آ گئی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس، گم صم سی اداس، بال بکھرے ہوئے۔ افسردگی اور حزن و ملال نے حسن کو بڑھا دیا تھا۔ آدھی سوئی آدھی جاگی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار۔ آنسوؤں کی جھیل میں ہچکولے لے رہا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر مصطفیٰ نے ہی پہل کی۔

"تین بج چکے ہیں۔ آپ سوئیں نہیں ؟"

"نہیں۔ نیند نہیں آتی۔" اس نے جیسے سسکی لی تھی۔

ملگجے اندھیرے میں پاس پاس بیٹھے دونوں کوئی پر اسرار وجود لگ رہے تھے۔ جیسے دنیا والوں سے پوشیدہ رہنے کی خاطر کہیں آسمان سے اتر آئے ہوں۔

"نیند تو مجھے بھی نہیں آتی۔ موسم گرم ہے۔ ابھی ابتدائی گرمیوں میں یہ حال ہے تو آگے اپریل مئی میں کیا ہوگا ؟ کیسی گرم ہوا چل رہی ہے۔" مصطفیٰ نے کہا۔ پھر انھوں نے اپنا ہونٹ کچل ڈالا۔ یہ رو کھی پھیکی سی بات بھی کوئی کہنے کی تھی۔ دل انھیں ٹہل رہا تھا۔ کہہ دو جو کچھ کہنا چاہتے ہو یہ جا رہی ہے۔ یہ جا رہی ہے۔ پھر ایسی خاموش ساعت تمھاری زندگی میں نہیں آنے کی۔ یہ پرسکوت لمحے۔ جب زمین آسمان میں سرگوشیاں سی ہو رہی ہوں ساز فطرت کچھ کہہ رہا ہو۔ یہ گم صم سا ماحول۔ یہ دم بخود سی فضا۔ کیا اسی بات کی منتظر نہیں ہے کہ دو چاہنے والوں کے لبوں سے نغمۂ محبت سنے۔ دیر کرنا عقلمندی نہیں۔ تھام لو اس کا ہاتھ۔ کہہ دو۔ پیارا میں تم سے

محبت کرتا ہوں۔ بہت محبت ہے مجھے تم سے۔ بشارا نہ جاؤ گی۔ اپنے ماں باپ سے اشاروں اشاروں میں کہہ دو کہ۔ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔

مگر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ دل چیختا رہا۔ دماغ میں آندھیاں چلتی رہیں۔ مگر ان کے بند لبوں نے جنبش نہ کی۔

اظہار محبت کتنی سبکی ہے۔ سبک سر بن کے پوچھنا۔ اس سے اس کی محبت کی بھیک مانگنا۔ نہیں۔ اگر اس کے دل میں ایسا کوئی جذبہ پرورش نہیں پا رہا۔ تو پھر اپنی نگاہوں میں آپ گرنے کے بعد اٹھنے کی کیا صورت ہو گی۔ محبت زبان سے کہہ کر نہیں کی جاتی۔ یہ تو وہ جذبہ ہے جو خاموشی میں بولتا ہے۔ آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ اداؤں سے عیاں ہوتا ہے۔ اسے گویائی عطا کرنا اس جذبے کی توہین کرنا ہے۔ بلا سے۔ یہ آتشی جذبہ جسم و جاں کو خاکستر کر دے۔ مگر اسے زبان دینا اسے آلودہ و ملوث کرنا تو شرافت نہیں لمحوں میں صدیاں گزر گئیں۔ جگ بیت گئے۔

بشارا کہہ رہی تھی۔ "مصطفےٰ صاحب آپ کبھی علیگڈھ نہیں آئے"۔

اپنے خیالات کے پاتال سے گزرنے میں مصطفےٰ کو برسہا برس گزر گئے۔

انھوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کچھ پوچھا آپ نے؟"

بشارا جھجکے سے بولی۔ "کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں" مصطفےٰ نے کہا "منتظر تھا کہ آپ کچھ کہیں گی۔ تو میں۔"

"میں نے کچھ پوچھا تھا آپ سے۔ آپ نے جواب نہیں دیا۔"

"کیا پوچھا تھا آپ نے؟"

"میں نے پوچھا تھا کہ کیا آپ کبھی علیگڈھ نہیں گئے؟"

"کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر۔ اب ضرور آؤں گا۔ آپ سے ملنے!"

"نہیں!" پیارا نے مدھم لہجے میں کہا۔ "مجھ سے ملنے نہ آئیے گا۔"

"کیوں۔ سیٹھ صاحب آپ سے ملنے پر اعتراض کریں گے؟"

"میں نہیں چاہتی!"

"میں آپ کا مطلب سمجھنے میں شاید غلطی کر رہا ہوں۔ آپ کیا یہی کہہ رہی ہیں کہ میں آپ سے ملنے۔ وہاں نہ آؤں؟"

"جی ہاں۔" یہی مطلب ہے میرا۔" پیارا ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"مصطفےٰ صاحب میں بہت کمزور ہستی ہوں۔ اور وہ احساس بہت بہت طاقتور ہے۔ جو آپ سے۔ آپ سے۔ وابستہ ہو گیا ہے۔ میں اس احساس کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ نہیں جانتے اور میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ جو کچھ میں آپ کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ وہ میری زبان سے کیسے نکل سکے گا۔ آپ مجھے بے حجاب بنائیں گے۔ اور میں اپنا حجاب اپنا نسائی وقار ہاتھ سے دینا نہیں چاہتی۔ معلوم نہیں آپ کیا سوچیں؟" پیارا ایک جذباتی احمق اور دل زدہ لڑکی تھی۔ "نہیں! نہیں!! مصطفےٰ صاحب مجھ پر جو کچھ بیتے گی وہ میں سہ لوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد میں آپ سے کبھی نہ مل سکوں۔ یہاں کبھی نہ آ سکوں۔ آپ سے میں یہی کہنا چاہتی تھی کہ۔ آپ۔ آپ مجھ سے اپنی یادیں واپس لے لیجئے۔ مجھے یاد نہ آئیے۔ کبھی نہیں!"

آنسوؤں نے اس کی زبان بند کر دی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

"پیارا!" مصطفےٰ نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور انھیں اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "جو احساس تمھیں ستا رہا ہے۔ وہی مجھے بھی اذیت پہونچا

رہا ہے۔ سچ مانو۔ میری پیارا اگر۔ جب پہلی دفعہ تم پر میری نظر پڑی تھی تبھی سے میرے گلستان تخیل میں عجیب سے پھول کھلنے لگے تھے جن کی مہک نے میری تمام روح کو معطر و معنبر کر دیا ہے۔ میں اس احساس کے نشے میں سرشار رہنے لگا ہوں۔ مگر۔ میں کسی سے یا تم سے کہتے ڈرتا تھا۔ کہ کہیں یہ میرا احساس شکست نہ ہو جائے۔ اور پھر میرے پاس جینے کا کوئی بہانہ رہ جائے۔ پیارا جب زندگی میں کوئی رعنائی نہ رہے تو پھر زندگی کس کام کی۔ ابھی میں اکیلا بیٹھا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ کہ کل صبح تم جا رہی ہو۔ پھر میں کب ملوں گا تم سے۔ اب صرف دید ہی کا ایک سہارا رہ گیا ہے۔ پیارا۔ اور کل کے بعد وہ بھی نہ رہے گا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ اب کل کے بعد کیا کروں گا میں۔ تمہارے جانے کے بعد۔ جو سوہان روح تنہائی بھر جائے گی۔ جا نگسل سناٹا چھا جائے گا۔ تو پھر ایسے مسرت انگیز چہل پہل۔ روح پرور یکجائی میں بدلنے کا کوئی ساذریعہ ہو گا۔ میرے پاس۔ تب کتنا ویران ہو جاؤں گا میں۔ پیارا۔ پیارا۔ بڑا ستم کیا ہے۔ تمہارے والد اور سیٹھ صاحب نے مجھ پر۔"

"ستم تو آپ نے کیا ہے مجھ پر۔" پیارا بولی۔ کیا آپ کو اپنے جذبوں کی صداقت کا یقین نہ تھا۔ کیا آپ مجھے اتنا باوقار سمجھتے تھے۔ کہ اگر آپ چچا جان اور ابا سے مجھے۔ مجھے مانگ لیتے تو کیا۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی نہ سمجھتی۔"

"اور کیا میں نہ سمجھتا پیارا۔ اگر تم میری زندگی میں آجاتیں۔ تو میں کتنا خوش نصیب ہو گیا ہوں۔" مصطفےٰ کے لہجے میں تلخی تھی۔ "لیکن ہماری خوش نصیبیوں سے انھیں کیا سروکار۔ جو اپنی جگہ شروع سے خوش قسمت ہیں۔"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"سمجھنے کی کوشش بھی نہ کرنا" مصطفیٰ نے کہا۔ ان کے خیالات کا رخ دفعتاً بدل گیا تھا۔ اس سے یہ سب کہنے کا مطلب تھا کہ اسے بھی پریشان کرنا۔ اسے ایک خلش میں مبتلا کر دینا۔ اگر مصطفیٰ اس کے نہ ہو سکتے تو عمر بھر کا روگ اسے لگانے سے کیا حاصل تھا۔ مصطفیٰ مرد تھے۔ ہمت اور صبر کی طاقت رکھتے تھے۔ یسارا کمزور لڑکی تھی۔ محبت کے روگ کو جان پر بنا لیتی تو اس کے جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ اسی لئے بروقت مصطفیٰ نے محبت کی لن ترانی سنانے سے زبان روک لی۔ اسے پریشان کرنا مناسب نہ تھا۔ اسے شاید اپنے والد کے قطعی انکار کا علم بھی نہ تھا پھر بھی وہ شاید اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ کبھی نہ کبھی مصطفیٰ اس کے ہو جائیں گے۔ ورنہ وہ بھولی بھالی لڑکی اپنی محبت کا برملا اظہار بھی نہ کرتی۔ مصطفیٰ کو کوفت ہونے لگی۔ یسارا کی زبان سے محبت کا اظہار انہیں اس کے شایان شان نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسے روکتے بھی تو کیسے۔ وہ وقت سہانا سا۔ سناٹے میں ملا ماحول۔ افق کی غبار آلود دھندلاہٹوں سے ابھرتے ہوئے چاند کا۔ زرد اور نامکمل چہرہ۔ صبح کاذب کی نقیب مسحور کن معطر ہوائیں۔ جھلملاتے ستارے اور سب سے بڑھ کر ایک چاہنے والے کا قرب یسارا کے معصوم دل نے پہلی بار محبت کی کسک محسوس کی تھی۔ اور وہ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ زخم دکھتا ہے تبھی لبوں سے کراہ نکلتی ہے۔

ویسے مصطفیٰ کا جی چاہ رہا تھا کہ حسن و محبت کی اس ادبی مورت کو وہ اپنے سینے سے لگا لیں۔ اس کے گال پر اپنے لب رکھ کر محبت کی دھیمی دھیمی سرگوشیاں کریں۔ اسے یقین دلائیں کہ جو آگ اس کے سینے میں شعلہ زن

ہے۔ اس سے ان کا دامن دل بھی نہیں بچ سکا۔ وہاں تو الاؤ بھڑک رہا ہے۔ لیکن انھوں نے اس پر سرد مہری اور بے رخی کی راکھ ڈال دی ہے۔

ان کا ذہن پھر بیگم احمد اور آمنہ خاتون کی متمائی گفتگو کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہزار انھوں نے ان کی با معنی باتوں کا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔ مگر ناکام رہے۔

"یشارا۔ اب تم جاؤ۔ صبح ہونے والی ہے" پژمردہ چاند ان کے سروں پر مدھم سی چاندنی لٹانے لگا۔ تب مصطفیٰ نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ سدرہ بھی تمھارے ساتھ جا رہی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں!" یشارا نے کہا۔ "جا رہی ہے۔ بھائی جان بھی جا رہے ہیں۔

"وہ لوگ وہیں سے کہیں اور گھومنے چلے جائیں گے" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش آپ بھی ہمارے ساتھ چلتے۔"

"ہاں۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ ایک ہی دفعہ سہی۔ پہونچوں آپ کے پاس۔ مگر اس میں دیر ہے۔" مصطفیٰ کے لہجے سے کسی قسم کی تپش کوئی اضطراب یا اشتیاق عیاں نہ تھا۔ یشارا کے دل سے محبت کا اذیت ناک تاثر فنا کرنے کی خاطر انھوں نے اپنے محبت بھرے دل پر ایثار و قربانی کی بھاری سل رکھ لی تھی۔ انھوں نے بے پروائی سے کہا۔ "اس لئے کہ یہاں چچا جان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بازل کے چلے جانے کے بعد ان کی خبر گیری کے لئے میرا یہاں رہنا نہایت ضروری ہے۔ مگر مجھے حیرت ہے۔ یشارا۔ آپ کے چچا جان۔ اپنے بھائی کو اس عالم میں چھوڑ کر جانا کیسے گوارا کر رہے ہیں۔ کیا وہاں پہونچ کر ان کا دل بھائی ہی کی طرف نہ لگا رہے گا؟

کیا بزنس ــــــ!"

"کیوں نہیں۔ مگر وہ بھی مجبور ہیں۔ کاروبار چھوڑے بہت دن ہو گئے بے حد ہرج ہو رہا ہے۔ اور وہ تو اس کے باوجود رک رہے تھے۔ مگر ابا نے ہی کہا۔ نہیں تم لوگ جاؤ۔ پیارا کو بھی لے جاؤ۔ وہ اکیلی یہاں گھبرائے گی۔ میرے لئے تو اس کی امی ہیں۔ پھر مصطفیٰ اور یاور صاحب ہیں۔ میری فکر نہ کرو لہٰذا اچھا جان مان گئے۔ مجھے تو خیر مجبوراً جانا ہی ہے۔ وہ لوگ میرے لئے ماں باپ سے بڑھ کر ہیں۔ ویسے وہ کہتے تو میں ابا کے پاس رک جاتی۔ مگر چچی نے کہا۔ تمہیں چلنا ہو گا۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"نہیں سب جائیں۔ میں تو یہاں ہوں۔ آ کر دیکھ لیا کروں گا۔" مصطفیٰ نے خشک سے لہجے میں جواب دیا۔

"آپ مجھے کچھ ناراض لگ رہے ہیں۔" مدھم سی روشنی میں پیارا ان کی طرف دیکھنے لگی۔ مدھم مدھم روشنی میں اسکا چہرہ افشاں کی طرح دمک رہا تھا۔

"کس سے۔؟" مصطفیٰ ہنسنے لگے۔

"مجھ سے۔"

"ناراض اور تم سے۔ یہ خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دو کہ میں تم سے کبھی ناراض ہوں گا۔"

"مصطفیٰ صاحب۔" اس نے بے حد چپکے سے کہا۔ اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ایک بات بتائیے گا۔؟"

"ضرور!"

"شرم آتی ہے۔ پوچھتے ہوئے، مگر۔ نہ پوچھوں تو۔ پچھتاوا رہ جائے گا عمر بھر کے لئے۔ اور پھر شاید وقت گزر جائے۔"

"پوچھو! پیارا! کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

"آپ میرے بارے میں کچھ سوچیں گے تو نہیں!"

"ہرگز نہیں!"

"تم۔ مصطفےٰ صاحب۔ بب۔ بس۔ یہ بتا دیجئے کہ۔ آپ مجھے یاد آئیں تو میں کیا کروں۔؟"

"یہ سوال اگر میں تم سے کرتا تو تم مجھے کیا جواب دیتیں۔"

"میں کہتی کہ۔ جسے پانا جس کے ہونا اپنے بس میں نہیں ہے۔ اس کی یاد میں چپکے چپکے شمع کی طرح جلنا اور شبنم کی طرح آنسو بہانا بھی کیا اپنے اختیار میں نہیں۔" یہ کہتے کہتے پیارا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"میرا جواب تو یہ ہے پیارا اگر جسے پانا اور اس کے ہونا اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ اس کے لئے چپکے چپکے رونا اور شمع کی طرح جلنا بھی تو عقلمندی نہیں۔ اسے بھلا دینا ہی اچھا ہی ہے۔"

"تو کیا آپ بھول جائیں گے مجھے۔" وہ رو پڑی!

"تمھیں پانے اور حاصل کرنے کی خوش رنگ امید میرے دل سے نہیں نکلی۔ تو پھر میں تمھیں کیسے بھول سکوں گا۔"

"سچ سچ۔"

"آنسو پونچھ لو پیارا۔ تمہارے آنسو مجھے تکلیف پہنچا رہے ہیں۔"

مصطفےٰ نے اس کے برف سے ننھے منے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا دیا۔ "اس طرح دل چھوٹا کرنا اور رونا اچھی بات نہیں۔ تم سمجھدار اور تعلیم یافتہ

اور شریف لڑکی ہو کبھی ایسی بے ضبطی اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کرنا۔ بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں میری بات مانو یُسارا۔ انتظار کرو اور امید رکھو۔"

"نہ میں انتظار کرسکتی ہوں۔ نہ مجھے کوئی امید ہے۔" یُسارا نے جواب دیا۔ اور یہ کہہ کر ابھرتی ہوئی روشنی میں ایک مدھم سی کرن کی طرح گھل مل گئی۔

"ستم ظریفِ تقدیر" ایک زہریلی مسکراہٹ مصطفیٰ کے خشک ہونٹوں پر بکھر گئی۔ وجہ تو کوئی نہیں۔ لیکن قسمت انھیں جدا کرنے پر ہی تلی ہوئی ہے یا پھر ماموں صاحب قبلہ کی بیگم صاحبہ کے کوسنے اور بد دعائیں رنگ لارہی ہیں۔ یہی تو کہہ گئی تھیں، وہ ایک دو تھپڑ مار کے۔ تمہارے دل کا چین چھن جائے۔ آگ لگ جائے تمہارے کلیجے میں۔ مظلوم کی بد دعا خالی نہ رہ جائے گی۔" وہ مظلوم بھلے نہ تھیں۔ مگر ان کی بد دعائیں خالی نہ گئی تھیں۔ مصطفیٰ کے دل کا چین لٹ چکا تھا۔ قرار کھو گیا تھا۔ لگ چکی تھی آگ ان کے دل میں۔ دن کے نکلنے تک وہ خزاں زدہ باغ میں خزاں زدہ ہی بیٹھے رہے تھے۔ رات بھر کی تھکن۔ جاگنے کا کسل ان پر حاوی تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ فجر کی اذان سن کر انھوں نے حوض کے پانی سے وضو کیا اور باغ سے نکل کر قریب کی مسجد میں چلے گئے۔

اسی شام بازل کا ولیمہ بھی ہو گیا۔ ایک مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں انتظام تھا۔ روشنیوں، خوشبوؤں اور خوشیوں کی وہ شام مصطفیٰ اور یُسارا کے دلوں پر سے اس طرح گزر گئی۔ جیسے کوئی برہنہ پاؤں صحرا کی جلتی ہوئی ریت پر سے گزر جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن سیٹھ صاحب اور ان کی بیگم، یُسارا کو لے کر علی گڑھ واپس جانے والے تھے۔ اور اس جدائی کے کرب نے انکے ٹوٹے دلوں کو کچھ اور توڑ دیا تھا۔ وہ رات ان پر

اسی طرح گزری کہ اپنا اندھیرا ان کی زندگیوں میں چھوڑ گئی۔

دوسرے دن شام کو احمد صاحب کے گھر پر ایک ہنگامہ تھا۔ دو گاڑیاں سامان سے لدی کھڑی تھیں۔ سیٹھ صاحب، ان کی بیگم اور پیارا سب سے رخصت ہو رہے تھے۔ بازل اور سدرہ بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ دونوں چند دن علی گڑھ میں رہنے کے بعد وہاں سے مسوری ہنی مون منانے جانے والے تھے۔ سدرہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ یاور صاحب اسے سینے سے لگائے اپنے آنسوؤں سے بیٹی کو سرسبز کر رہے تھے۔ بیگم یاور الگ رو رہی تھیں۔ یہی کچھ حال پیارا کا تھا۔ وہ احمد صاحب سے چمٹی سسکیاں لے رہی تھی۔ بیگم احمد اسے سمجھا رہی تھیں۔ خود احمد صاحب کا برا حال تھا۔ وہ آج دوبارہ بیمار لگ رہے تھے۔ سیٹھ صاحب پر بھی غم کا اثر تھا۔ مصطفیٰ اور بازل سنجیدہ اور خاموش ایک کنارے کھڑے تھے۔ آخر کار بازل نے آگے بڑھ کر پیارا کو تھاما۔ احمد صاحب کے گلے لگے۔ اور پیارا کو لے کر گاڑی کی طرف چل دیئے۔ اور مصطفیٰ نے سدرہ کو چمکارتے ہوئے گاڑی میں لے جا کر بٹھا دیا۔

"بھائی صاحب آپ فکر نہ کریئے گا۔ خدا نہ کرے کوئی ضرورت ہوئی تو میں جہاں بھی ہوں گا فوراً آپ کے پاس آ جاؤں گا۔ اور بھابھی آپ بھی خیال رکھیئے گا ان کا۔" پھر وہ مصطفیٰ اور یاور صاحب کی طرف مڑ گئے۔ "بھائی صاحب اور بیٹے ہم لوگوں پر ہی انھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"آپ اطمینان رکھیں" یاور صاحب بولے "مصطفیٰ بھی بازل کی طرح ہیں۔ ہمارے رہتے احمد بھائی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اور بیٹے بازل تم بالکل بے فکر ہو کر تفریح کرنا۔"

"جی۔ بہت اچھا۔" باذل کچھ شرما سے گئے۔ پھر اسی طرح سب رخصت ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن یاور صاحب، مصطفےٰ، الماس اور اس کے شوہر، منّو اور کئی لوگ جا رہے تھے۔ اور ان سب کے ساتھ وہ خاتون بھی تھیں جن کی ایک جھلک پہلے مصطفےٰ نے دیکھی تھی۔

"امّی!" مصطفےٰ نے بیگم یاور سے پوچھا۔ "یہ کون محترمہ ہیں۔؟"

"یسارا کی پرانی آپا ہیں۔" بیگم یاور نے جواب دیا۔ "ان کے چہرے کو کیا ہوا ہے؟" مصطفےٰ نے پوچھا۔

"سنا ہے کہ جل گئی تھیں۔" بیگم یاور بولیں۔ "ایک طرف کا چہرہ اتنا ڈراؤنا ہے اور دوسری طرف کا چاند کا ٹکڑا۔ جوانی میں تو قیامت رہی ہوں گی۔" "نام کیا ہے؟" مصطفےٰ کو یکایک ان سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ عجیب خاتون تھیں۔ اتنی گوشہ نشین کہ کہیں گھر بھر میں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ اور جہاں کسی مرد کا سایہ تک دکھائی دیتا وہ وہاں تو کھڑی ہی نہ ہوتیں۔

"یسارا انھیں سیدہ خالہ کہتی ہے۔ یہی نام ہے کہ دوسرا کچھ اور مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مگر کیا کہوں۔ اتنی با اخلاق، سلیقہ مند، شیریں زبان اور ہمدرد ہیں کہ۔ کیا کہوں تم سے جب احمد صاحب پر دورہ ہوا ہے تب ان کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ ماہئی بے آب تھیں۔ ساری رات سجدے کئے ہیں۔ ان کی صحت کی دعائیں مانگی ہیں۔ اتنی بیقرار تو شاید صفیہ بھابی بھی نہ تھیں۔ کسی معزز اور شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہیں۔ نجانے کیا بیتی ہے غریب پر کہ آیا گیری کرنی پڑی!"

"بچے وچے ہوں گے ان کے؟"

"نہیں میاں۔ کوئی نہیں۔ نہ بچّے نہ میاں۔ نہ ماں۔ باپ۔ اکیلی ایک جان ہیں۔ بے چاری پُیارا کو تو اس قدر چاہتی ہیں۔ کہ کیا کوئی ماں اپنی بیٹی کو چاہے گی۔"

"بھئی اب چل دیں سب لوگ۔ ٹرین کا وقت ہونے آرہا ہے۔" سیٹھ صاحب نے بہ آوازِ بلند سب کو مخاطب کیا۔ اور ایک آخری سلام و دعا کے ساتھ سب روانہ ہو گئے۔ پُیارا اور مصطفےٰ الگ الگ گاڑیوں پر تھے۔ اب تک دونوں نے ایک دوسرے سے نگاہیں چرائی تھیں۔ لیکن — اسٹیشن پہونچ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ پُیارا نے مصطفےٰ کی آنکھوں میں اپنے درد کی تصویر دیکھی۔ اور مصطفےٰ نے پُیارا کی آنکھوں میں اپنی مایوسی کو تیرتے پایا۔ پُیارا اب پھر رو رہی تھی۔ اور سیٹھ صاحب اسے سمجھا رہے تھے۔ بے چارے مصطفےٰ، وہ تو کھل کر رو تے بھی کس طرح۔ سدرہ کو گلے لگا کر انھوں نے چند آنسو دنیا کو دکھا نا گوارا کیے۔ اور بس باقی دریا ان کے دل کی اداس وادی میں بیقرار موجزن ہوتا رہا۔

گاڑی چلی گئی۔ وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے۔

احمد بھائی اور یاور صاحب کے بھرے پورے ہنستے اور پر رونق گھروں پہ اب اداسی کے سناٹے چھائے رہتے تھے۔ یاور صاحب اور بیگم یاور بیٹے کی اُداسی اور خاموشی دیکھتے۔ اس کا سبب سمجھتے اور اپنے آپ کو کچھ کرنے سے مجبور پاتے۔ سدرہ کی شادی سے ایک دن قبل سیٹھ صاحب یاور صاحب کے پاس آئے تھے۔ اور انھوں نے کہا تھا کہ مجھے مصطفےٰ بہت پسند ہے۔ مگر نہ جانے کیوں احمد صاحب نے انکار کر دیا۔ اور انکار کے فوراً بعد ان پر جو دورہ پڑا تھا۔ اس سے سبب

متفکر تھے۔ لہٰذا ابھی دیشار اور مصطفےٰ کے لئے کوئی بات ان سے نہیں کی جا سکتی۔ آپ لوگ صبر کریں۔ وہ اچھے ہو جائیں تو میں خود ان سے بات کروں گا۔"

بیگم یاور اور یاور صاحب نے سیٹھ صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے فی الحال اس مسئلے پر خاموش رہنے کا وعدہ کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے بیٹے کی دن بدن بڑھتی ہوئی اداسی دیکھ دیکھ کر کڑھنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ایک دن بیگم یاور نے مصطفےٰ سے کہا تھا۔ "بیٹا تمھارے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ کہو تو کہیں اور دیکھوں۔" مگر مصطفےٰ نے بڑی بے رُخی سے کہہ دیا تھا کہ "مجھے ابھی شادی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

ادھر احمد صاحب اور ان کی بیگم کے گھر میں بھی اداسی سی چھائی رہتی تھی۔ صرف منورہ گیا تھا جو کچھ زندگی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ الماس چند دن رک کر سسرال واپس چلی گئی تھیں۔ نوکر چاکر کئی تھے۔ مگر خاموش، سنجیدہ اور گوشہ نشین بازل کے چلے جانے سے عجیب سا سناٹا ہو گیا تھا۔ نئی دلہن بھی چلی گئی تھی اور سارے مہمان بھی۔

مصطفےٰ روز شام کو احمد صاحب کے وہاں خیریت لینے آجاتے تھے تھوڑی دیر احمد صاحب کے پاس بیٹھتے پھر چلے جاتے۔ احمد صاحب اور بیگم احمد ان سے بے حد محبت کا مظاہرہ کرتے۔ مگر مصطفےٰ کو سب جھوٹ محسوس ہوتا۔ آخر کیوں انھوں نے ان کا پیغام ٹھکرا دیا تھا۔ اور پھر ان کے ذہن میں رہ رہ کر وہ سوال اٹھتا تھا جس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ آخر وہ کون سا راز تھا جس نے احمد صاحب کی یہ حالت کر دی تھی۔؟ نہ جانے انھیں کیوں یقین تھا کہ یہ راز دیشار اسے بھی متعلق ہے۔

لیکن ان کے سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔

بیس روز بیت گئے اسی طرح۔ درمیان میں بازل کا خط آیا تھا۔ کہ وہ اور سدرہ مسوری جا رہے ہیں۔ علی گڑھ میں سب خیریت ہے۔ البتہ بیارا کو بخار آرہا ہے۔ شاید کوئی انفکشن لگ گیا ہے۔ دوا دی جارہی ہے۔ سیٹھ، جب مجی کاروبار کے سلسلے میں لندن چلے گئے ہیں۔ خود بازل مسوری میں دس روز رہنے کے بعد حیدرآباد واپس آجائیں گے۔ بازل نے اپنے خط کے آخر میں کچھ اور بھی لکھا تھا۔

"میرے بھائی تو مجھے ابا کے انکار کی وجہ تو نہیں معلوم مگر جو بھی ہو۔ میں جانتا ہوں اس سے تمھیں بہت صدمہ ہوا ہو گا۔ خود مجھے بے حد غم ہے تم جیسے انسان کی ہم سفر میری پیاری بہن بنے۔ یہی میں خود بھی چاہتا ہوں۔ خیر ابھی تو ابا کی حالت ایسی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے واپس آؤں گا۔ تو کوشش کروں گا کہ یہ جان سکوں کہ انھوں نے انکار کیوں کیا تھا۔ شاید اس کے بعد کچھ ہو سکے۔

فی الحال تم صبر کرو۔ مایوس نہ ہو۔ سیٹھ صاحب بھی شاید تمھیں ہی پسند کرتے ہیں۔ اور ابا کے اچھے ہو جانے پر وہ بھی تمھاری سفارش کریں گے۔"

مصطفےٰ کو اس خط نے کوئی سکون دینا تو درکنار اور بیقرار کر دیا تھا۔ بیارا کے بخار کی خبر سن کر ان کا دل پریشان ہو اٹھا تھا۔ اور احمد صاحب کے انکار کی وجہ معلوم کرنے کے لئے وہ پھر بے چین ہو اٹھے تھے۔ احمد صاحب اب پہلے سے کافی اچھے تھے۔

—اتوار کا دن تھا۔ آج مصطفےٰ صبح ہی احمد صاحب کی خیریت لینے آئے تھے۔ گھر کے باہر ٹیکسی دیکھ کر وہ ذرا حیران ہوئے۔ تبھی احمد صاحب کا ملازم باہر نکلا۔ تو انھیں دیکھ کر اس نے سلام کیا۔ "سلام علیکم صاحب! آئیے دیکھئے دُلارا بیٹی آ گئی ہیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

مصطفےٰ دل ہاتھوں میں لئے اندر چلے گئے۔ سامنے والے کمرے میں —بڑے صوفے پر دُلارا لیٹی تھی۔ اس کا سر بیگم احمد کی گود میں تھا۔ احمد صاحب پاس ہی بیٹھے تھے۔ اور آمنہ خاتون دلارا کے پیروں کے پاس بیٹھی تھیں۔

مصطفےٰ کی آنکھوں نے دلارا کا بے جان سا پیکر اور اس کا پیلا پڑا ہوا چہرہ دیکھا، تو خود ان کا رنگ اڑ گیا۔ ان کے دل نے ایک برق سی ان پر گرا دی۔ جاؤ اور اسے اپنی باہوں میں بھر لو۔ پوچھو اس سے کہ یہ کیا حال بنا لیا ہے۔ لیکن مصطفےٰ کچھ نہ کر سکے۔ اپنے چہرے پر سے ہٹے ہوئے نقاب کو ایک بار پھر انھوں نے اوڑھ لیا تھا۔ اور اب وہ احمد صاحب سے پوچھ رہے تھے۔

"کیا ہوا انھیں۔ سب خیریت تو ہے؟"

جواب آمنہ خاتون نے دیا۔ "کیا کروں بیٹا جب سے علی گڑھ گئی ہے بخار میں مبتلا ہے۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ شروع میں بخار کم ہو گیا تھا۔ مگر سدرہ اور بازل کے چلے جانے کے بعد پھر سے تیز ہونے لگا۔ سیٹھ صاحب بھی باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں پریشان ہو کر یہاں لے آئی ہوں۔ اب تم ہی لوگ کچھ کرو۔ میری بچی کو نجانے کیا ہوا ہے۔"

"آخر ڈاکٹروں نے بتایا تو ہو گا۔ کہ بات کیا ہے؟"

"ہاں۔ کوئی کہتا ہے۔ ٹائیفائڈ بخار ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ وائرل انفکشن ہے۔ مگر میری بچی کو اچھا کوئی نہ کر پایا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی کسی اچھے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔"

مصطفےٰ کا برا حال تھا۔ وہ جانے کے لئے مڑے۔ مگر تبھی وہ ڈاکٹر صاحب آگئے جنہوں نے احمد صاحب کا علاج کیا تھا۔ انھیں احمد صاحب نے پہلے ہی فون کر دیا تھا۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب۔ دیکھئے میری بچی کو۔" بیگم احمد روئے دے رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پیارا کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ وہ اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اب آنکھیں تک نہیں کھول پاتی تھی۔ بس بے سدھ سی پڑی رہی۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے سارے ٹیسٹوں کی رپورٹیں دیکھیں۔ پرانے نسخے دیکھے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے نسخہ لکھنے لگے۔

"کچھ بتائیں گے ڈاکٹر صاحب کہ آپ کا کیا خیال ہے۔" احمد صاحب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرا جو خیال ہے اس کی حقیقت آپ لوگوں کو زیادہ معلوم ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی کو کوئی شدید صدمہ ہوا ہے۔ اور وہی اس کی اس بیماری کی جڑ ہے۔ اسے شدید ڈپریشن کی شکایت ہے جس وجہ سے اس کے جسم کا مدافعتی نظام کمزور ہو گیا ہے۔ اور بخار بھی اسی وجہ سے ہے۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ آپ اسے اس کی خوشیاں لوٹا دیں۔ یہ اچھی ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر صاحب چلے گئے اور وہاں موجود ان سب لوگوں کو ایک اور

آزمائشیں ہیں چھوڑ گئے۔ ایک ایسی آزمائش جس کو ختم کرنے کی ہمت ان بچوں سے کسی میں نہ تھی۔

ابھی رات باذل اور سدرہ بھی آ گئے۔ وہ دیبا کی بیماری کا حال جان کر مسوری سے فوراً چل دئیے تھے۔ سیٹھ صاحب کو بھی لندن فون کیا جا چکا تھا۔ اور دوسری صبح وہ بھی آ گئے۔ ایک بار پھر احمد صاحب کا گھر بھرا پورا تھا۔ لیکن اب سب کے دم سے کوئی رونق نہ تھی۔ سب پریشان تھے۔ سب خاموش تھے۔ سبھی کا دل دیبا میں لگا تھا۔ اور اب پہلی بار مصطفےٰ نے دیبا کی آیا۔ ان خاتون کو دیکھا تھا۔ جو سب سے زیادہ پریشان معلوم ہوتی تھیں۔ اور جو رات دن دیبا کے پاس ہی بیٹھی رہتی تھیں۔

دیبا کا عالم یہ تھا کہ زبردستی ہی کچھ کھاتی پیتی تھی۔ بولتی ذرا بھی نہ تھی۔ بس چپ پڑی رہتی تھی۔ ایک بار اس نے پھر مصطفےٰ کو نگاہ بھر کر دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک ابھر آئی تھی۔ لب مسکرانے کے لئے کھلے تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے پلکیں جھکا لی تھیں۔ اور منھ پھیر لیا تھا۔ بے چارے مصطفےٰ کا حال عجیب تھا۔ ان سے اپنا غم نہ تو دکھایا جاتا تھا۔ نہ چھپایا جاتا تھا۔ تنہائی پاتے ہی ان کی آنکھیں بے قابو ہو جاتی تھیں۔ دو روز اسی طرح گزر گئے۔ دیبا کسی سے کچھ بتاتی بھی نہ تھی کہ آخر اسے غم ہے تو کیا غم ہے؟ یہ تو بس سدرہ تھی۔ جو جانتی تھی کہ جس آگ میں دیبا جل رہی تھی وہ برہا کی آگ تھی۔ آخر کار اس نے باذل کو دیبا کی مصطفےٰ سے محبت کا حال سنا ہی ڈالا۔ پھر جس طرح برسوں سے خاموش

آتش فشاں پھٹتا ہے۔ اسی طرح بازل بھی پھٹ گئے۔ اب انھیں باپ کی صحت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اب کوئی انھیں نہ روک سکتا تھا۔ اور اس رات وہ احمد صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس تہیئے کے ساتھ کہ آج وہ ان کے انکار کی وجہ پوچھ کر ہی رہیں گے۔

احمد صاحب ابھی سوئے نہ تھے۔ بازل کو دیکھ کر ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "آؤ بیٹا بیٹھو۔ حالانکہ اب گیارہ بج رہے ہیں تمھیں سو جانا چاہیئے تھا۔ میرے لئے پریشان مت ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔"

"پریشان تو ہوں ہیں ابا۔ بہت پریشان ہوں۔ ایک طرف آپ کی صحت کی فکر ہے۔ دوسری طرف یسارا کا حال اب دیکھا نہیں جاتا ہے۔ وہ غم جو اسے کھائے جا رہا ہے۔۔۔۔۔"

"یسارا کے لئے خود میرا دل روتا ہے بیٹا لیکن اسے کون سا غم ہے وہ بتائے تو۔ تمھاری ماں، آمنہ خاتون، سدرہ، الماس سبھی تو اس سے کچھ معلوم کرنے میں ناکام ہو رہی ہیں۔ خدا قسم میری بچی کا دکھ مجھے معلوم ہو جائے۔ تو میں کسی بھی طرح اسے دور کر دوں۔ کیا رنگ ہو گیا ہے اس کا اللہ رحم کرے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اسے کون سا دکھ ہے۔ ابا۔ مگر میں بتاؤں گا تب ہی جب آپ یہ وعدہ کرلیں گے کہ آپ کسی بھی قیمت پر اس کا دکھ دور کریں گے۔"

"ہاں بیٹے بتاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"تو سنئے۔ یسارا مصطفٰے سے دل ہی دل میں محبت کرتی ہے جس طرح وہ اس سے محبت کرتے رہے ہیں۔ یہ راز صرف سدرہ کو معلوم

تھا۔ اور اس نے آج صبح اصلیت بتائی ہے۔ آپ نے مصطفیٰ کے پیغام کو ٹھکرا کر ہی اس بے چاری کا یہ حال کیا ہے۔ ابّا آخر کیا وجہ ہے آپ کے انکار کی۔ مصطفیٰ جیسے اچھے انسان کا رشتہ آپ نے کیوں کر ٹھکرا دیا۔ اور آج میں آپ سے اس سوال کا جواب لے کر ہی رہوں گا۔ اور وہ بوجھ کون سا ہے۔ وہ کون سا غم ہے۔ جو خود آپ کو کھائے جا رہا ہے۔ اللہ کے لئے آج کچھ نہ چھپایئے گا ابا میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ کا راز میرا راز بھی رہے گا۔ آپ کو میری قسم بیسارا کی قسم آج آپ مجھے بتا دیں۔ اور ـــ میری اس جسارت کے لئے مجھے معاف کر دیں۔"

"نہیں بیٹے۔ اچھا ہی ہے کہ آج میں سب کچھ کہہ دوں ـــ شاید اسی طرح میری روح کو قرار آ جائے ـــ اب میں کچھ بھی نہ چھپاؤں گا۔

وہ ایک لمحہ رُکے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"یہ بات اس وقت کی ہے۔ جب تم چار سال کے تھے۔ آفس کی طرف سے مجھے اننتا پور قصبے کے ایک گاؤں کا سروے کرنے کا کام سونپا گیا تھا۔ چونکہ وہ کام سال بھر کا تھا۔ لہٰذا میں اکیلا ہی وہاں چلا گیا۔ وہاں جا کر میں ایک ڈاک بنگلے میں رہنے لگا۔ ایک روز شام کو میں چہل قدمی کر رہا تھا تو مجھے ایک لڑکی دکھائی دی تھی۔ اور میری ساری کنواری زندگی اسی لمحہ تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ وہ ایسی حسین تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ اس کے بعد سے میں ہر وقت اسی کی تلاش میں رہتا۔ چند دن بعد ہی مجھے معلوم

ہوا کہ وہ وہاں کے امیر کسان سرفراز علی کی بیٹی ہے۔ اس کا نام جمالہ ہے۔

میں نے سرفراز علی سے تعلقات بڑھائے۔ اور ان کے گھر آنے جانے لگا۔ جمالہ کے دل میں بھی شاید میری محبت کا جذبہ موجزن ہو گیا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں چھپ چھپ کر تنہائیوں میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

مجھ پر محبت کا جوش اتنا شدید تھا کہ میں اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔ تمھاری ماں اور تم سب کو بھلا بیٹھا تھا۔ وقت گزرتا گیا اور بات بڑھتی گئی۔ نوبت یہاں تک آ پہونچی کہ ہمارے بارے میں لوگ سرگوشیاں کرنے لگے۔

بات کہاں تک چھپتی۔ آخر کار سرفراز علی کو بھی اس بات کا علم ہو گیا۔ ان کی بیوی کا انتقال عرصے پہلے ہو چکا تھا۔ ان کا ایک بیٹا تھا۔ جو شہر میں رہتا تھا۔

جمالہ ان کی جان ان کی زندگی تھی۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس کی ہر بات ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

جب انھیں یہ علم ہوا کہ جمالہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ تو انھوں نے مجھ سے اس کی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور مجھے بلا کر بات کی اور مجھ سے کہا میں تم دونوں کی شادی جلدی کر دینا چاہتا ہوں۔ اور میں بھی نکاح کیلئے تیار ہو جاؤں۔ مجھ پر تو دیوانگی سوار ہی تھی۔ میں تم لوگوں کو ــــ اپنے آپ کو ــــ اپنی ذمہ داریاں

اپنا فرض سب کچھ بھول گیا تھا۔ سرفراز علی نے فوراً ہی ہمارا نکاح کروا دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ صورت شکل کا میں خود بھی بے حد اچھا تھا۔ اچھی ملازمت تھی لہٰذا انھوں نے بھی تحقیق کی کوئی ضرورت نہ سمجھی۔ پھر بدنامی بھی ہونے لگی تھی۔ اور اس طرح ایک ہی رات میں میں دوسری شادی کر چکا تھا۔ اور تب میرا ضمیر جاگا۔ صبح تم سب یاد آئے۔ اور میں اس پاگل پن سے اس جنگل کی آگ سے جو جمالہ کا عشق تھا۔ فرار حاصل کرنے کی سوچنے لگا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں چند دن اپنے ضمیر کی آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب رہا۔ اور جمالہ کے حسن و عشق میں غرق ہو گیا۔ لیکن ضمیر ایک بار جاگ جائے تو اسے زیادہ دیر خاموش رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ مجھے پھر تم لوگ یاد آنے لگے۔ یہ خطرہ ہو گیا کہ تمھاری ماں تک یہ خبر پہونچ نہ جائے۔ اور پھر ایک رات میں نے اپنی زندگی کا دوسرا گناہ کیا۔ میں چپکے سے وہاں سے فرار ہو گیا۔ لیکن میں ایک خط جمالہ کے نام چھوڑ آیا تھا۔ جس میں میں نے ساری سچائی لکھ دی تھی۔ اور اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ میرے پیچھے نہ آئے گی۔ بلکہ میرا انتظار کرے گی۔ حتیٰ کہ میں خود آکر اسے لے جاؤں گا۔ اپنے دل میں میں نے سوچا تھا کہ کسی طرح تمھاری ماں کو اپنے جرم دغا سے آگاہ کروں گا۔ شاید وہ مجھے معاف کر دیں اور جمالہ کو قبول کر لیں۔ لیکن مجھ میں اس کی بھی ہمت نہ تھی۔ کہ آخر ایک روز وہی ہوا کہ جس کا مجھے خوف تھا۔ سرفراز علی ایک روز میرے آفس سے میرا پتہ لگا کر میرے گھر آ پہونچے تھے۔ انھوں نے آ کر تمھاری ماں سے ساری باتیں کہہ دیں۔ اور جب میں شام کو آفس سے آیا تو میری

نگاہیں ہمیشہ کے لئے نیچی ہو چکی تھیں۔ آمنہ اور سیٹھ بھائی بھی گھر پر تھے۔ اور ان کو بھی سارا علم ہو چکا تھا۔ لیکن پھر سرفراز علی نے ایک اور کہرام میری زندگی میں پیدا کر دیا۔ تمھاری ماں نے بڑی ہمت سے ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے شوہر نے اگر دوسرا نکاح کر لیا ہے تو میں ان کی دوسری بیوی کو قبول کر لوں گی۔ اور اس طرح جب میں شام کو آیا۔ تو انھوں نے میرے سامنے بھی یہی بات دہرا دی مگر اب سرفراز علی جو طیش و غضب کے آدمی بنے ہوئے تھے یکایک موم و پانی کی طرح ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔ جمالہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ حویلی میں آگ لگی تھی اور وہ اس میں جل کر مر گئی۔ لیکن مرنے سے چند دن پہلے ہی اس نے ایک بچّی کو جنم دے دیا تھا۔ اور اب وہ بچّی جمالہ کے بھائی کے پاس ہے۔ سرفراز علی نے مزید کہا۔ کہ جمالہ مرنے سے پہلے دو باتیں کہہ گئی تھی۔ ایک یہ کہ اس بچّی کو اس کے باپ کو ہی دے دیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی شادی جمالہ کے بھائی کے کسی لڑکے سے ہی کی جائے۔ یہ دو وصیتیں اس نے کی تھیں۔ میرا تو خیر برا حال تھا۔ مگر تمھاری ماں نے سرفراز علی سے کہہ دیا کہ وہ اس بچّی کو انھیں لا کر دے دیں۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ کہ وہ کس کی بچّی ہے۔ وہ کہیں چلی جائیں گی اور وہاں سے لوٹیں گی تو دنیا سے اعلان کر دیں گی۔ کہ وہ بچّی خود ان کی ہے ـــــ اور اس طرح سے ـــــ"

"تو۔ پیارا ـــــ پیارا۔ ہی وہ بچّی ہے۔ ابا؟"

"ہاں بیٹے۔ پیارا ہی وہ بد نصیب ہے۔ اور اس کی ماں کی

وصیت کے مطابق مجھے اس کی شادی جمالہ کے بھائی کے کسی بیٹے سے ہی کرنا ہوگی۔ یہی وجہ تھی کہ میں مصطفےٰ سے اس کی شادی نہیں کر سکتا تھا۔"

بازل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھوں نے اپنے باپ کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ یہ حیرت انگیز انکشافات نے انھیں دم بخود کر دیا تھا۔ ان کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ ان کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ ان کے دل میں اپنے باپ کی محبت تڑپ رہی تھی۔ کیسے دکھ اٹھائے تھے انھوں نے۔ کس آگ کے دریا سے وہ گزرے تھے۔ ایک چھوٹی سی بھول نے انھیں ساری عمر تڑپایا۔ اور رُلایا تھا۔ اور پھر بازل کو اپنی ماں کا خیال آیا۔ کیا گزری ہوگی ان کے دل پر۔ وہ کتنی عظیم عورت تھیں۔ جنھوں نے اپنے شوہر کی لغزشوں کو نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ اپنی سوت کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔

احمد صاحب پھر کہنے لگے تھے "یشارا کی خاطر تمھاری ماں سیٹھ صاحب کے ہاں علی گڑھ چلی گئیں۔ سرفراز علی نے یشارا کو وہیں پہنچا دیا اور پھر اس کو لے کر وہ یہاں واپس آگئیں۔ ساری دنیا یہی سمجھی کہ یشارا ان کی بیٹی ہے۔ لیکن علی گڑھ کے قیام کے درمیان تمھارے چچا اور چچی کو یشارا سے بے پناہ محبت ہو گئی۔ ان کے تو کوئی اولاد ہو نہ سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے اپنی ساری ممتا یشارا پر لٹانا شروع کر دی۔ پھر جب تمھاری ماں تم تینوں کو لے کر یہاں آگئیں تو سیٹھ بھائی اور آمنہ خاتون بے قرار ہو گئے۔ اور چند ماہ بعد ہی آکر یشارا کو مانگ لیا۔ پہلے تو میں نے انکار کر دیا۔ جمالہ کی وصیت مجھے یاد تھی۔ کہ بیٹی اپنے باپ کے زیر سایہ ہی پرورش پائے۔ مگر سیٹھ بھائی نے کہا کہ میں آپ سے زیادہ محبت

اسے دوں گا۔ آخر کار میں مان گیا۔ اور اس طرح دیشارا کو انھیں دے دیا
اس پر تمھاری ماں پہلے راضی نہ تھیں۔ مگر پھر سیٹھ بھائی اور آمنہ خاتون
کی محبت اور اصرار کے آگے وہ بھی ہار مان گئیں۔

"لیکن ابا سرفراز اور ان کے بیٹے۔ وہ سب پھر کہاں گئے کہاں ہیں؟"

"سرفراز علی کا انتقال چند برسوں کے بعد ہی ہو گیا۔ شاید وہ بیٹی کی
جدائی کا غم برداشت نہ کر سکے۔ ان کے بیٹے جمالہ کے بھائی اب بھی انتپار
پور میں رہتے ہیں۔ ان کے تین بیٹے ہیں۔ دو لندن میں ہیں اور تیسرا
ابھی زیر تعلیم ہے۔ پچھلے سال ان کا خط آیا تھا۔ اور انھوں نے اپنی بہن
کی نشانی کو اپنے بڑے بیٹے کے لئے مانگا تھا۔ اور میں نے ہاں کر دی۔ مگر
ابھی تک ہم نے اس بات کو کسی سے کہا نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان کا بیٹا
لندن سے اگلے سال واپس آئے گا۔ اور شادی بھی تب ہی ہو گی۔ لہٰذا
تب ہی ہم عام اعلان کرتے۔ جمالہ کے بھائی بھی یہ راز نہ کھولیں گے کہ
دیشارا ان کی بہن کی بیٹی ہے۔ اس کا وعدہ میں نے عرصہ پہلے ان سے لے
لیا تھا۔ کسی اور وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ دیشارا کو یہ سب کبھی نہ معلوم
ہو پائے۔ ورنہ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔" احمد صاحب پھر خاموش
تھے۔ بازل نے انھیں صراحی سے پانی نکال کر پلایا۔ "جیتے رہو بیٹے!
آج میں تمھاری نظروں میں بھی گر گیا ہوں گا۔ لیکن میرا دل پرسکون ہے۔
اپنا بوجھ ہلکا کر کے آج میں پہلی بار سکون محسوس کر رہا ہوں۔ بیٹے۔ تم
کیا جانو۔ کہ میں نے اپنی زندگی کے یہ برس کس جہنم میں گزارے ہیں۔ جمالہ
کی موت کا بھی ذمہ دار میں خود کو سمجھتا ہوں۔ تمھاری ماں کا دل بھی میں
نے توڑا ہے۔ گو کہ اس شریف عورت نے آج تک مجھ سے شکایت نہ کی

ہے۔ مگر جو ان کے دل پر گذری ہوگی وہ میں جانتا ہوں اور اب ـــ اب
یشارا کی مصطفےٰ سے شادی کرنے سے انکار کرکے میں نے اس کا بھی دل
توڑ دیا ہے۔ لیکن اس کی ماں کی وصیت کا پاس بھی تو مجھے کرنا ہے۔ اب میں
کیا کروں۔ اے اللہ تو ہی کوئی حال تلاش کر دے۔ میری مدد کر میرے مولا۔"
اور ایک بار پھر احمد صاحب کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا۔ اور بازل بے بس
سے بیٹھے اپنے باپ کے امتحان کی گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں
بھی بھر آئیں اور دل بے چین ہو گیا۔ ایک دعا ان کے دل سے ایسی نکلی کہ جسے
فوراً ہی سن لیا گیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور کوئی آ کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ بازل
نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ اور ایک لمحہ کے لئے حیران رہ گئے۔ وہاں کوئی اور
نہیں یشارا کی آپا کھڑی تھیں۔

"آپ!" حیرت سے بازل نے کہا۔ اور احمد صاحب بھی حیران و پریشان
ہو گئے۔ "جی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن میں نے آپ لوگوں کی ساری باتیں سن لی
ہیں۔ اور اب میں بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" وہ بولیں۔

"اور آپ نے جب سب سن لیا ہے۔ تو کہئے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔"
بازل کو غصہ آچکا تھا۔ اور احمد صاحب شکست خوردہ سے پلنگ
پر ٹیک لگائے پڑے کھالی کھالی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔
اور ان خاتون نے بہت ہی آہستہ اور نیچی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"احمد صاحب میں جو کچھ کہنے جا رہی ہوں وہ میرے لئے آسان نہیں
ہے۔ مگر یشارا کی خاطر مجھے آج اپنی زبان کھولنی پڑ رہی ہے۔ میں سب
کچھ کہنے آپ کے پاس آرہی تھی۔ مگر آپ دونوں کو باتیں کرتے سن کر میں

باہر ہی رک گئی۔ اور وہ سب سن لیا جو آپ لوگ کہہ رہے تھے۔ سنیئے میری بات غور سے۔ جمالہ مری نہیں تھی۔ وہ آج بھی زندہ ہے۔"

"کیا۔؟" احمد صاحب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھوں میں۔ عجیب سی وحشت تھی۔ عجیب سی بے قراری تھی۔" جمالہ زندہ ہے۔ کہاں ہے وہ۔ تمھیں کیسے معلوم ؟ کون ہو تم۔؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے آپ سکون سے میری بات سنئے۔ جب آپ جمالہ کو چھوڑ کر شہر چلے آئے تھے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سرفراز علی نے آپ کے شہر کا پتہ وغیرہ معلوم کر لیا تھا۔ اور جمالہ کو لے کر وہاں آنے والے تھے لیکن جمالہ نے انھیں منع کر دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ آپ کی اس طرح رسوائی ہو گی۔ پھر اسے یقین تھا کہ آپ کو اسکی محبت خود بخود کوئی حل تلاش کرنے پر مجبور کر دے گی۔ اس لیئے اس نے انتظار کرنے کی ٹھان لی۔ پھر اسے علم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے ضبط و صبر سے کام لیا۔ اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ایک حسین سی بچی نے اس کی سونی زندگی میں جنم لے کر بہاروں سے اسے بھر دیا۔ لیکن ابھی وہ اس بچی کو ٹھیک سے پیار بھی نہ کر سکی تھی۔ کہ قدرت نے اس کے ساتھ ایک اور مذاق کیا۔ رات کو کمرے میں کسی طرح سے آگ لگ گئی۔ جمالہ سو رہی تھی بچی اس کے بغل میں تھی آگ کی لپٹیں کھڑکی کے پردوں کو جھلساتی پلنگ کے سرہانے آ گئیں اور اس سے پہلے کہ جمالہ بیدار ہوتی۔ ایک لپٹ نے اس کا آدھا چہرہ جلا دیا تھا۔ وہ چیختی ہوئی بچی کو دبائے پلنگ پر سے بھاگی لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اس کا آدھا چہرہ جھلس چکا تھا۔ اور اسکی وہ بے پناہ خوبصورتی اب ایک گھناؤنی بدصورتی میں تبدیل ہو چکی تھی۔"

احمد صاحب اور بازل کے چہرے ایک بار پھر متغیر ہو چکے تھے۔ وہ دونوں اپنے سامنے کھڑی اس عورت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جس کا چہرہ خود آدھا جلا ہوا تھا۔

"تم — تم جمالہ ہی ہو — میرے خدا۔" احمد صاحب کانپ رہے تھے۔ اور بازل پسینے میں نہائے سانس روکے دم بخود اس عجیب و غریب ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ جو قدرت نے کھیلا تھا۔

"ہاں۔ میں ہی جمالہ ہوں۔ اور میں نے خود سرفراز علی اپنے والد سے کہا تھا کہ وہ جا کر آپ سے کہہ دیں کہ میں مر گئی ہوں۔"

"مگر۔ مگر — تم نے ایسا کیا کیوں جمالہ۔" احمد صاحب ایک بار پھر رو رہے تھے۔ "میں اور کیا کرتی۔ اس خوبصورتی کے بدصورتی میں بدل جانے کے بعد کہ جس پر آپ مرمٹے تھے۔ میرا جینا فضول تھا۔ میں کیا منہ لے کر آپ کے پاس آتی۔ پھر کیا آپ مجھے اپناتے ہیں۔ بس میں نے یہی مناسب سمجھا کہ نثار کو آپ کے پاس بھیج دوں۔ اور خود روپوش ہو جاؤں۔ ابا بھی دو برس بعد گزر گئے۔ اور پھر میں بالکل اکیلی ہو گئی۔ میں نے جو وصیتیں ابا کے ذریعہ آپ کو کہلوائی تھیں وہ بھی ایک مصلحت سے تھیں نثار اپنے باپ کے گھر پلے۔ یہی اس کے لئے بہتر تھا۔ اور اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کی شادی کا وعدہ میں نے اس لئے لیا تھا کہ بڑی ہو کر جب وہ سسرال آئے تو میرے ہی گھر آئے۔ جہاں میں برسوں سے جمع کی ہوئی ممتا اس پر لٹا دوں — لیکن — تقدیر کو میرے ساتھ مذاق کرنے میں لطف آتا ہے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میری بھاوج کا سلوک مجھ سے بے حد ظالمانہ تھا۔ میں نے ایک سال برداشت کیا پھر

تنگ آگئی۔ اور پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ کیوں نہ آپ کے وہاں چلی جاؤں۔ جمالہ بن کر نہیں۔ بلکہ ایک غریب بے سہارا عورت بن کر اور آپ کے وہاں نوکری کر لوں۔ اس طرح عزت سے زندگی بھی گزر جائے گی۔ اپنے سرتاج کی خدمت بھی کر لوں گی۔ اور اپنی بیٹی کو پال پوس بھی لوں گی۔ اور میں ہمت کر کے یہاں چلی آئی اور یہ مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے پہچان نہ سکیں گے۔ احتیاط کے طور پر میں ہمیشہ اپنا چہرہ اور زیادہ چھپائے رہی۔ اور اس طرح میں پیارا کی آیا بن کر آپ کے اور پھر سیٹھ صاحب کے گھر میں رہنے لگی۔"

"جمالہ —— جمالہ۔ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ میں جو ناانصافی، جو گناہ کئے ہیں۔ اللہ توبہ ہے۔ جمالہ"۔ احمد صاحب سسکیاں لے رہے تھے۔ اور بازل انہیں سنبھال رہے تھے۔

"نہیں۔ آپ ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں برسوں سے دیکھ رہی ہوں۔ خود آپ بھی اپنے ضمیر کے جہنم میں جلتے رہے ہیں۔ کوئی لمحہ آپ نے سکون اور چین سے نہیں گزارا ہے۔ آپ بھی تڑپتے اور بلکتے رہے ہیں۔ آپ —— آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں اتنے برس بہت خوش رہی ہوں اور میری بچی کی شادی ہو جائے۔ بس یہ آخری خوشی مجھے اور چاہیئے۔ پھر میں سمجھوں گی کہ اللہ نے جتنے غم دیئے تھے۔ وہ سب اتنی ہی خوشیاں دے کر برابر کر دیئے۔ آپ پیارا کی شادی مصطفٰے سے طے کر دیں۔ میری بچی اچھی ہو جائے خوش رہے۔ بس مجھے اور کیا چاہیئے۔"

"مگر، مگر۔ اب تم —— تم اب اس طرح نہیں رہ سکتی ہو جمالہ۔"

"للہ کے واسطے۔ آپ میرے بارے میں نہ سوچیں۔ کیا آپ چاہتے

کہیں۔ کہ ایک بار پھر میں رسوا ہوں۔ کیا آپ پھر سے بازل کی والدہ کو اذیت دینا چاہتے ہیں۔ اور دیشارا ہے۔ اس پر کیا بیتے گی ساری سنجائی جان کر۔ نہیں۔ آپ سب کچھ بھول جائیں۔ میں ایک غریب عورت ہوں۔ جو بدستور سیٹھ صاحب کے گھر میں پڑی رہوں گی۔ آپ بس دیشارا کی شادی مصطفےٰ سے جلد از جلد کر دیں۔"

"جمالہ۔ جمالہ۔" احمد صاحب کی آواز تھی کہ درد نے گویا زبان پائی ہو لیکن جمالہ بیگم کمرے سے جا چکی تھیں اور اب ــــــ اب وہاں مکمل خاموشی تھی۔ احمد صاحب چور چور سے بازل کی باہوں میں پڑے تھے اور بازل کی آنکھیں رواں تھیں۔

"آپ گھبرائیں نہیں ابّا۔ اللہ جو کچھ کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔ یہ راز میرے بھی سینے میں دفن رہے گا۔ اس کی خبر کسی کو نہ ہو گی۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا ابّا۔ آپ ہمت رکھئے۔ ابھی تو آپ کو دیشارا کی شادی کرنا ہے۔ ہے نا؟"

اور احمد صاحب کے خشک ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آ کر چلی گئی۔ وہ اقرار تھی اس بات کا کہ انھوں نے بھی یہ حقیقت قبول کر لی ہے۔

دوسرے دن احمد صاحب نے یاور صاحب کو بلا کر مصطفےٰ کے رشتے کو قبول کر لیا۔ اور یاور صاحب سے اپنے پہلے انکار کا سبب یہ بتا دیا کہ "مجھے ڈر تھا کہ میرے اقرار کر لینے سے سیٹھ بھائی بُرا نہ

مان جائیں۔ یاور صاحب اور ان کی بیگم اتنا خوش تھے کہ انھوں نے کوئی دھیان بھی نہ دیا۔ انھیں ان کے بیٹے کی خوشیاں مل رہی تھیں۔ انھیں اور کیا چاہیئے تھا۔

سدرہ اور الماس نے ثیارا کو جاکر یہ خوش خبری سنائی ہی تھی کہ گویا اس میں نئی زندگی پڑ گئی۔ جس طرح گرمی سے جھلسے ہوئے چمن بارش کے قطروں سے سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مصطفیٰ کو پالینے کی خوشی نے ثیارا کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ اور وہ حسین پھول جو مرجھا گیا تھا۔ چند ہی دنوں میں دوبارہ کھل کر گلاب ہو چکا تھا۔

دو ہفتے بعد ثیارا کی شادی مصطفیٰ سے ہو گئی۔ اور رخصتی کے وقت جب ثیارا کی آپا کو تلاش کیا گیا کہ وہ بھی دلہن سے رخصت ہو لیں۔ تو وہ کہیں نہ ملیں۔ آخر بارات رخصت ہو گئی اور پھر باوجود تلاش کے جمالہ بیگم کسی کو پھر نہ مل سکیں۔

احمد صاحب پر جمالہ بیگم کی گمشدگی کا شدید اثر ہوا۔ انھیں اپنی لغزش کی ایک ایسی سزا ملی تھی کہ اب خدا کو بھی ان پر ترس آنے لگا تھا وہ ثیارا کی شادی کے چند ماہ بعد ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ خدا ان کی مغفرت کرے۔

خود ثیارا کو جمالہ بیگم کی گمشدگی نے حیران کر دیا تھا۔ لیکن مصطفیٰ کی محبت میں وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اسے اپنی آپا کبھی کبھی یاد آجاتی تھیں۔ اور تب سوائے ان کی گمشدگی پر حیرت کے اظہار کے وہ اور کچھ نہ محسوس کرتی تھی۔ اللہ اسے بھی ہمیشہ خوش رکھے۔

اور بازل ــــ بازل جن کے دل میں اپنی پہلی منگیتر کی جدائی کے غم

نے بڑی وسعتیں پیدا کر دی تھیں۔ وہ اب اپنے باپ کی دردناک زندگی کا غم بھی اپنے سینے میں ہمیشہ کے لئے دفن کر چکے تھے۔ اللہ انھیں اور ہمت دے۔

اور وہ برہا کی آگ کی جلی ہوئی تقدیر کی ماری ہوئی زندگی جس کا نام جمالہ بیگم تھا۔ وہ تو نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہو گی۔ لیکن وہ جہاں بھی ہو اللہ اس کی حفاظت کرے۔ آمین

ختم شد